طنز و مزاح

بحرِ تبسم

شوکت تھانوی

بحرِ تبسم

(طنز و مزاح)

شوکت تھانوی

میز

خدا بخشے علامہ شبلی کہا کرتے تھے کہ ولایت والوں سے ہندوستانیوں نے صرف دو ہی چیزیں حاصل کی ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک برف، دوسری میز۔ خیر برف کے متعلق تو ہماری رائے یہ ہے کہ اگر اس نعمت کو ولایت والے ہم سے واپس لے لیں تو عنایت ہوگی۔ رہ گئی میز اس کے دراصل ہم بھی معتقد ہیں اور اس اعتقاد کی وجہ صرف یہ ہے کہ اب تو خیر میز گویا روزی کا ٹھیکرا ہے مگر اس ذمہ دارانہ زندگی سے قبل بھی میز کے اور ہمارے تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔ گھریلو زندگی سے لے کر سکولی زندگی تک بس یہ سمجھ لیجئے کہ میز ہی میز تھی اور تا دم تحریر اسی میز کا سلسلہ جاری ہے تو اب آپ ہی سمجھ لیجئے کہ ان دیرینہ تعلقات کے ہوتے ہوئے ہم میز کے کیوں کر نہ معتقد ہوں اور اس کو اپنی ضروریات زندگی میں ایک اہم درجہ کیوں کر نہ دیں؟

انگریزوں کے یہاں یا ہندوستانی صاحب لوگوں کے یہاں تو آپ کو اس کثرت سے مختلف اقسام کی میزیں نظر آئیں گی کہ آپ حیران رہ جائیں لکھنے کی میز الگ ہوگی کھانے کی میز الگ، تاش کھیلنے کی الگ، سگریٹ پینے کی الگ، حجامت کی الگ، منہ ہاتھ دھونے کی الگ، سنگار کی الگ، گراموفون کی الگ، مختصر یہ کہ سینکڑوں کاموں کے لئے سینکڑوں میزیں آپ کو علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گی۔ کسی میز پر صرف ایک تصویر رکھی ہوئی ملے گی تو کسی میز پر صرف سگریٹ کی راکھ احتیاط سے رکھنے والا برتن، کوئی میز چینی اور شیشے کے برتنوں سے لدی ہوئی نظر آئے گی تو کوئی میز مکمل ہندوستانی دواخانہ ہوگی۔ کسی میز پر صرف پانیر رکھا ہوگا تو کسی میز پر صرف ایک بڑا سا گھونگا غرض تو کیا کہ بس قدم قدم پر میز ہی میز ملے گی لیکن یہ صرف ان دولت خانوں میں ممکن ہے جہاں روپیہ کی بارش ہر موسم میں ہوتی ہے اور مغربی تقلید کے جوش میں صاحب خانہ یہ قسم کھا چکتے ہیں کہ اگر انگریز کے مکان میں دس میزیں ہوتی ہیں تو ہم بیس سے کم نہ رکھیں گے رہ گئے ہمارے ایسے ”حکم قرارداد دیوالیہ“ کی ضمن میں آنے والے معززین، میز ان کے یہاں بھی ہوتی ہے مگر اس طرح ہوتی ہے کہ پچاس کاموں کے لئے ایک میز یعنی اسی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا ہے اور میز ہمارے اسی کام میں آ رہی ہے کہ عین اسی وقت اندر سے کھانا آ گیا اب ہم جلدی جلدی کاغذ، قلم، دوات، بلاٹنگ وغیرہ وغیرہ کو ایک طرف سمیٹ کر یا میز پر سے اٹھا کر بستر پر رکھ کر میز خالی کر دیں گے اور نہایت باقاعدگی سے اسی میز پر کھانا چن دیا جائے گا لیجئے یہ کھانے کی میز بن گئی۔ کھانے کے بعد دل چاہا تو اسی پر پاندان رکھ کر تنبولی کی دکان کھول لی۔ پاندان اٹھایا یا اسی کے کسی گوشے میں رکھ کر آئینہ، داڑھی بنانے کا صابن، استرا، برش وغیرہ

لے کر بیٹھ گئے اور دست خود دہان خود کے اصول پر چلتے ہوئے اپنی داڑھی خود ہی صاف کر دی مختصر یہ کہ جب تک وہ میز ہمارے سامنے ہے جس قدر بھی کام ہم کو پڑیں گے سب اسی میز سے پورے کئے جائیں گے۔ چنانچہ آج ہم محض آپ کو سمجھانے کے لئے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہماری میز کس پایہ کی ہے اپنی میز صاف کرتے ہیں تاکہ آپ بخوبی اندازہ کر سکیں کہ میز کثرت استعمال سے کیا ہو جاتی ہے۔

یہ میز خاص ہماری میز ہے جو ہمارے پلنگ سے ملی ہوئی کمرہ کے ایک کونے میں محض اس لئے رکھی ہوئی ہے کہ اگر ہم لکھتے لکھتے اتفاقاً کبھی اونگھ جائیں تو صبح اپنے کو بستر ہی پہ پائیں یا اگر کبھی سوتے سوتے آنکھ کھل جائے اور کچھ لکھنے کو دل چاہے تو چارپائی پر بیٹھے میز کی مدد سے ہم اپنا یہ حوصلہ بھی پورا کر لیں اس میز کے متعلق ہمارا قطعی حکم یہ ہے کہ اس کو کوئی بھی نہ چھوئے چنانچہ اس میز کے قریب بھی کوئی نہیں جاتا اور یہی وجہ ہے کہ ہم ضرورت کے وقت اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اسی میز پر مل جاتی ہیں بہرحال آج ہم محض آپ کی خاطر اپنی میز صاف کرتے ہیں اور ایک ایک چیز اٹھاتے ہیں، تاکہ آپ ہماری اس میز کے مرتبہ سے آگاہ ہو جائیں۔

پہلی چیز جو ہم اپنی میز پر سے اٹھا کر بستر پر رکھ رہے ہیں وہ پانوں کی ڈبیہ ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پانوں کی ڈبیہ ایک اہل قلم کے واسطے قلم سے کم ضروری نہیں ہے بات یہ ہے قلم تو وہی الفاظ کاغذ پر لکھے گا جو دماغ میں آئیں مگر ایک اہل قلم کا دماغ اس وقت تک کام ہی نہیں دے سکتا جب تک اس کا منہ پان چبانے کے لئے نہ چلے دوسری چیز بٹوہ ہے اس میں ڈلی، تمباکو اور الائچی وغیرہ ہے غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بغیر ان لوازم کے پان نہیں کھایا جاتا۔ یہ دیکھئے لیمپ ہے اور یہ محض اس لئے میز پر رہتا ہو کہ جب رات کو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس ضرورت کو بغیر اس لیمپ کے پورا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بہ نظر احتیاط دن کو ہم اس لیمپ کو میز پر سے نہیں ہٹاتے کہ اگر اس کو ہٹایا تو یہ غائب ہو جائے گا یہ ایک موزہ ہے اس کی جوڑ کا دوسرا موزہ عرصے سے غائب ہے لہٰذا اس کو ہم نے صرف اس لئے میز پر رہنے دیا ہے کہ ممکن ہے وہ مل جائے ورنہ یہ بھی کھو جاتا اور اس کے کھو لنے کے بعد کھوئے ہوئے موزے کا ملنا بھی بیکار ہوتا۔ دیکھئے یہ بظاہر ایک میلا سا کپڑا ہے مگر ہے بہت مفید اس سے لیمپ کی چمنی بھی صاف کر لی جاتی ہے۔ اگر میز پر گرد و غبار ہو تو اس کپڑے کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ فاؤنٹین پن میں روشنائی بھرنے کے بعد اسی کپڑے سے نب صاف کیا جاتا ہے مختصر یہ کہ یہ بہت مفید چیز ہے۔ یہ سوڈے کی بوتل کا ربڑ والا چھلا ہے اور اس کو ہم نے اس وقت کے لیے محفوظ رہنے دیا ہے کہ فرض کر لیجئے ہم لکھ رہے ہیں پورے انہماک کے ساتھ اور کوئی بچہ کسی بات پر مچل گیا اور لگا اس طرح رونے کہ ہم پھر ایک لفظ بھی آگے نہ لکھ سکیں اس وقت یہ چھلا دے کر اس کو بہلایا جا سکے گا یہ ہے ٹائمز آف انڈیا کا ہفتہ وار ایڈیشن ہے تو بہت پرانا مگر اس میں تصویریں

بہت عمدہ عمدہ ہیں جن کو ہم فریم کرانے کے متعلق مسلسل دو سال سے غور کر رہے ہیں۔ یہ لیجئے بیگم صاحب نے اس کے لئے کنویں میں بانس ڈلوا دیئے اور گھر کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر کہیں نہ ملا۔ یہ پاندان کا ڈھکنا غالباً اس روز میز پر آیا تھا جب ہم پانوں کی ڈبیہ دفتر میں بھول آئے تھے وہ تو کہئے کہ میز کی وجہ سے محفوظ بھی رہ گیا ورنہ یہ بھلا ملتا کہیں' یہ سینما کا اشتہار ہے اچھا' ایک بات تو یہ ہے کہ اگر آج سینما والے یہ اعلان کر دیں کہ ایک ہزار روپیہ اس شخص کو انعام دیا جائے گا جو ہمارے سینما کا سب سے پرانا اشتہار پیش کرے تو یہ انعام ہم ہی کو مل سکتا ہے۔ خدا جانے یہ اشتہار کیوں کر رہ گیا یعنی پانچ سال کا پرانا اشتہار ہے اس عرصہ میں ہم نے دو ایک مرتبہ تو ضرور میز صاف کی ہوگی مگر یہ ہمیشہ اسی میز پر رہا۔ خیر یہ اب تک رہا ہے تو اب بھی رہے گا یہ ایک رسالہ ہے جس کے ایڈیٹر صاحب سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم مضمون ضرور بھیجیں گے مگر بھول گئے۔ اب تو یہ رسالہ بھی بند ہو گیا مگر اس رسالہ کی میز پر موجودگی اس لئے ضروری ہے تا کہ کسی اور رسالہ سے وعدہ کرنے کے بعد ہم نہ بھولیں یہ دیکھئے یہ بچوں کے کھیلنے کا موٹر ہے اس میں کوک بھر دیجئے اور چھوڑ دیجئے تو خود بخود چلتا ہے۔ ایک مرتبہ صاحبزادے نے اس کو توڑ ڈالا تھا تو ہم نے بمشکل تمام اس کی مرمت کی اور اس دن سے اس کو اپنے ہی پاس رکھ لیا ہے تا کہ بچے خراب نہ کریں۔ یہ کنجی کیسی؟ ہاں خوب یاد آیا یہ کنجی بیگم صاحب نے پھینک دی تھی تو ہم نے چپکے سے اٹھا کر رکھ لی تھی کہ جب وہ ڈھونڈھیں گی تو ہم ان کی اس لا پروائی پر ان کو سبق دیتے ہوئے کنجی دے دیں گے مگر عجیب اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے ہم سے آج تک ذکر ہی نہیں کیا' خیر داشتہ آید بکار' رہنے دیں اس کو پھر دیکھا جائے گا۔ یہ خط ہے کسی کا اور عرصہ سے محض اس لئے رکھا ہوا ہو کہ شاید ہم کو یاد آ جائے کہ ہم نے اس کو کیوں رکھا تھا مگر اب تک یاد ہی نہیں آیا۔ یہ مس سلوچنا کی تصویر ہے افسوس ہے کہ اس احتیاط کے باوجود اس پر تیل کا دھبہ خدا جانے کہاں سے پڑ گیا ورنہ یہ تو اس قابل تصویر تھی کہ اس کو شیشے میں جڑوا کر لگایا جاتا اور یہی خیال بھی تھا ہمارا مگر خیر اب تو یوں ہی رہے گی یہ بات ہے اس تیل کی کپی کی جس کی وجہ سے یہ تصویر خراب ہوئی ہے۔ لاحول ولا اس روز جب بچے کی موٹر کی مرمت کی ہے تو اس کپی سے موٹر میں تیل دیا تھا اسی روز سے یہ یہاں پڑی ہے مگر اب تو اس کا سب تیل ہی گر گیا ہے اب اس کے رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ ایک ڈکشنری ہے اور بہت قیمتی ڈکشنری ہے خصوصاً ٹائمز آف انڈیا کے معمے حل کرنے میں تو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر بھی تھوڑا سا تیل پڑ گیا وہ تو کہئے کہ صرف جلد خراب ہوئی ورنہ کتاب ہی غارت ہو جاتی لیجئے یہ سروتہ یہاں رکھا ہے جس کے متعلق تلاش سے تھک جانے کے بعد بیگم صاحب کا قطعی خیال یہ تھا کہ ہو نہ ہو دھوبن چرا لے گئی ہے اور ان کا یہ خیال غلط نہیں تھا بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر یہ سروتا ہماری میز پر احتیاط سے رکھا ہوتا تو یقیناً دھوبن کے یہاں ہوتا وہ ضرور چرا لے جاتی اور اب بھی اگر ہم نے اس کو میز پر سے ہٹایا تو یہ چوری جائے گا۔ یہ دیا سلائی

کی ایک خالی ڈبیہ ہے۔ بظاہر تو یہ ایک بیکار سی چیز ہے لیکن اگر آپ کو آج ہی کوئی انگوٹھی اپنے کسی عزیز یا دوست کے نام بذریعہ پارسل بھیجنا پڑے تو یہی بیکار سی چیز اس قدر کارآمد ثابت ہوگی کہ آپ واقعی خوش ہو جائیں گے آپ کہیں گے کہ یہ لکڑی خواہ مخواہ میز پر کیوں رکھی گئی ہے مگر سنئے یہ خواہ مخواہ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ پاجامہ میں ازار بند ڈالنے کے لئے اگر قلم استعمال کیا گیا تو اس کی نب مجروح ہوگئی اور پنسل استعمال کی گئی تو ٹوٹ گئی اس مستقل بدتمیزی اور نقصان سے بچنے کے لئے ہم نے یہ لکڑی لا کر رکھی ہے اب آپ بھی کہیں گے یہ کس قدر ضروری چیز ہے۔ یہ خط لکھنے کے کاغذوں کا پیڈ ہے یہ لفافوں کا ڈبہ ہے یہ ایک دوات ہے حالانکہ اس میں روشنائی نہیں ہے لیکن اگر آپ ذرا سا پانی اس میں ڈال دیں اور دو منٹ اس دوات کو ہلائیں تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ کو نہایت خوش رنگ روشنائی تیار ملے گی۔ بات یہ ہے کہ اس کی روشنائی خشک ہوگئی ہے۔

یہ اونی کپڑوں کے نمونوں کی کتاب ہے جو لال املی سے آئی تھی۔ اس میں عجیب عجیب ڈیزائن کے کپڑے ہیں چنانچہ جس دن ہم کو کپڑا خریدنا ہوتا ہے ایک دن پہلے سے ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ہم کو کپڑے کی خریداری میں بہت سی آسانیاں محض اس نمونوں کی کتاب کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ بائیسکل کا لیپ ہے ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ میز پر اس کا کوئی تک نہیں مگر یہ تو خیال فرمائیے کہ اگر ہم اس کو میز کے علاوہ کہیں اور رکھیں تو صاحبزادگان بلند اقبال عرصے سے اس تک میں ہیں کہ ان میں سے ایک بنے ریلوے انجن کا ڈرائیور اور ایک گارڈ بن کر اسی سائیکل کے لیمپ کو گارڈ کی لالٹین بنا کر ہلائے مختصر یہ کہ ہماری سائیکل بے لیمپ کی ہو جائے اس لئے کہ اس کھیل کے بعد اس کا ٹوٹ جانا برحق ہے تو جناب اس کو ہم اسی لئے میز پر رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیے دیوان غالب ہے غالباً اس کی موجودگی ہماری خوش مذاقی کی ایک روشن دلیل ہے ہم کبھی کبھی جب موسم خراب ہوتا ہے یعنی بارش وارش ہونے لگتی ہے یا ہم کو بخار وخار ہو جاتا ہے تو اس کو چارپائی پر لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ یہ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی فہرست ہے اس میں گھڑیوں کی تصویریں دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں۔ یہ اخبار ”تیج ویکلی“ کا فائل ہے اس کے متعلق ہماری سخت ہدایت یہ ہے کہ یہ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ احتیاط سے رہے اور دوسرے اخبارات کے ساتھ ردی میں بیچا نہ جائے اس لئے کہ اس کے متعلق ہمارا مصمم ارادہ یہ ہے کہ اس کے فائل کی جلد بندھوائیں گے افسوس اس غیاث اللغات کو چوہوں نے کاٹ ڈالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری میز پر بھی چوہے آنے لگے ہیں اور اب مجبوراً ہم کو میز پر چوہے دان بھی رکھنا پڑیگا ورنہ سب چیزیں یہ چوہے تناول فرما جائیں گے۔ یہ رسالہ ”آئینہ“ ہے دہلی سے نکلتا تھا' بہت اچھا رسالہ تھا اب عرصہ سے نہیں نکلا ہے۔ ہم نے اس کو نہایت احتیاط سے محض اس لئے رہنے دیا ہے کہ اس آئینہ میں ہم اپنی خود غرضی کا چہرہ دیکھ سکیں اس بے چارے نے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات کی بنا پر ہم سے بارہا

مضمون طلب کیا مگر ہم نے اجرتی مضامین کے پیچھے اس کی پروانہیں کی افسوس ہمارے حال پر یہ کنین کی گولیاں ہیں اور یہ امرت دھارا ہماری آخری وصیت اپنی اولاد سے یہ ہوگی کہ ان دونوں چیزوں کو بلکہ ٹینچر آئیڈین کو بھی ہمیشہ اپنی اسی میز پر رکھا کریں۔ یہ داڑھی بنانے کے لئے پانی رکھنے والی کٹوری ہے جو حضرات داڑھی بناتے رہتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہوں گے۔ یہ قینچی ہے اور یہ ہمارا پرانا بٹوہ ہے اس کو محض اس لئے رہنے دیا ہے کہ اگر نیا بٹوہ کھو جائے تو اسی سے کام لیا جاسکتا ہے یہ بائیسکل کا پمپ ہے اس سے ہم دو کام لیتے ہیں ہوا بھی بھرتے ہیں اور رول کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اگر میز پر سے اس کو بچے اٹھا لے جائیں تو ایک دوسرے کے منہ میں ہوا بھرنے کے کام میں لا کر اس کے یہ دونوں مفید کام ختم کرا دیں اب میز پر صرف دو چیزیں رہ گئی ہیں ایک قلمدان جس میں علاوہ قلم، پنسل، ربڑ وغیرہ کے سوئی اور تاگہ بھی ہے اور دوسری چیز ہمارا آفس بکس ہے جس میں آگے سے تو تالا پڑا ہوا ہے اور کنجی کھو گئی ہے۔ پیچھے سے قبضے ٹوٹ جانے کی وجہ سے نہایت آسانی سے کھل جاتا ہے اس میں بہت سی ضروری چیزیں از قسم اقرار نامے بیعنامے، کچھ تصاویر ہمارا خاندانی شجرہ، لائف انشورنس کمپنی کے کاغذات وغیرہ وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔

میز کا سامان تو ختم ہو گیا اور باقی رہ گئی گرد وہ بھی جھاڑ دیتے ہیں۔ مگر ٹیبل کلاتھ کے نیچے بہت سے کاغذات رکھے ہوئے ہیں جو ایسے ضروری ہیں کہ ہم ان کو چھیڑنا نہیں چاہتے اس کے بعد میز کے اس گوشہ میں جو دیوار کی طرف ہے مکڑی نے جالا تان رکھا ہے۔ ہم چاہیں تو اس جالے کو صاف کر سکتے ہیں مگر آپ ہی بتائیے کہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ گویا ہم اپنی صفائی کے لئے اس بے زبان مخلوق کا گھر تباہ کر رہے ہیں، اگر بجائے ہمارے وہ اشرف المخلوقات میں سے ہوتی تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا ہم اس غریب کی بد دعا سننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس کو یوں ہی رہنے دیتے ہیں بہر حال خدا آپ حضرات کا بھلا کرے کہ آج آپ کے طفیل میں ہماری میز ایک عرصے کے بعد صاف کی گئی ہے۔

◆ ◆ ◆

چائے

یہاں ان بدمذاقوں کا ذکر نہیں ہے جو چائے سے اس طرح گھبراتے ہیں جس طرح بھیڑ یا بارش سے یا ہم بھیڑیے سے اور نہ ان موسمی انسانوں سے بحث ہے جو جاڑے کے دنوں میں تو خیر چڑیا اوور کوٹ سمجھ کر چائے پی لیتے ہیں لیکن گرمی شروع ہوتے ہی چائے ایسی چھوڑتے ہیں گویا کبھی پی ہی نہ تھی، حالانکہ تمام ہندوستان کے ہوٹلوں سے لے کر سٹیشن تک بخط جلی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ ’’گرم چائے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے‘‘ لیکن سچ پوچھیے تو یہ لوگ چائے کو چائے سمجھ کر کبھی پیتے ہی نہیں ورنہ چائے ایک مرتبہ پینے کے بعد کوئی چھوڑے تو بہ کیجیے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ان لوگوں کو تو اگر کتھا گھلے ہوئے گرم پانی میں تھوڑا سا دودھ اور تھوڑی سی شکر ملا کر دے دی جائے تو واللہ ان کو تمیز نہ ہوگی کہ کیا نوش فرما رہے ہیں ایسے ’’چائے ناشناس‘‘ انسانوں کو چائے پلانا چائے کی توہین کرنا اور لپٹن کمپنی لمیٹڈ کی قسمت پھوڑنا ہے۔ ان لوگوں سے وہ بیچارے بدرجہا غنیمت ہیں جنہوں نے اس ڈر کے مارے اب تک چائے نہیں پی ہے کہ شاید اس میں سنکھیا کا جزو ہوتا ہے اور اگر خلاف عادت چائے پی لی جائے تو موت بھی واضح ہو سکتی ہے خیر ان لوگوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ

’’چائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں‘‘

لیکن واللہ کمال کرتے ہیں وہ لوگ جو ایک مرتبہ چائے پی لینے کے بعد پھر اس کو چھوڑ سکنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی چائے نوشی بھی موسمی ہوتی ہے کم از کم ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم کو پہلی مرتبہ چائے پینا یاد نہیں ہے اور نہ کسی مرتبہ چائے کا چھوڑنا یاد آتا ہے بس اتنا یاد ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے جس طرح اپنے آپ کو برابر کھانا کھاتے ہوئے اور برابر پانی پیتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں اسی طرح چائے بھی جاری ہے ایسا اتفاق تو خیر بارہا ہوا ہے کہ کسی وقت کھانا نہ کھایا اور طبیعت ہلکی رہنے کے لئے فاقہ کر ڈالا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ ایک وقت بھی چائے چھوٹی ہو اور نہ یہ کوئی آسان کام تھا بارہا ہم کو بہت سے ناصح شفیق قسم کے لوگوں نے سمجھایا کہ چائے سے خشکی ہوتی ہے چائے سے اختلاج ہوتا ہے چائے سے نیند خراب ہو جاتی ہے، چائے سے مثانہ کمزور ہوتا ہے اور چائے سے یہ ہو جاتا ہے اور چائے سے وہ ہو جاتا ہے لیکن ہم نے بھی اس سے بادہ خوار کی طرح جو زاہدوں کے وعظ کو بکواس سمجھتا ہے

کبھی ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اثر نہ لینے پر مجبور بھی تھے یہ تو خیر معمولی باتیں تھیں لیکن اگر ہم کو یہ بھی یقین دلایا جاتا کہ چائے پینے سے طاعون ہوجاتا ہے یا چائے پینے سے کالرا یقینی ہو یا چائے پینے سے دق کا تیسرا درجہ فوراً شروع ہوجاتا ہے تو بھی ہم چائے ترک کرنے سے تو معذور ہی تھے اور ہم ہی پر کیا منحصر ہے ہم نے تو جتنے بھی ان چائے پینے والوں کو دیکھا ہو جو صحیح معنوں میں چائے نوش ہیں سب کا یہی حال پایا کہ اس لپٹن والی کمپنی کے مرید ہوکر رہ گئے ہیں۔ بلکہ جس طرح آغا حشر صاحب کاشمیری نے بادہ خواروں کے متعلق فرمایا ہے کہ

گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

اسی طرح ہم چائے خواروں کے متعلق عرض کریں گے کہ

جو ڈوبے پرچ پیالی میں نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے اس کیتلی کے گرم پانی میں

سچ تو یہ ہے کہ ہم ہیں اور میخواروں میں سوائے اس کے اور فرق ہی کیا ہے کہ وہ ایک حرام شراب پیتے ہیں اور ہم حلال شراب بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جس شراب کا نام یادہ کوثر ہے وہ شاید یہی شراب ہے جس کو ہم سب چائے کہتے ہیں اگر یہ خیال غلط بھی ہے تو وہ بادہ کوثر یقیناً چائے سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوگی اور نہ بھی ہو تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چائے ہماری شراب ہے اور اللہ میاں نے اس کو حرام نہیں کیا ہے لوگ اس کی یہ وجہ بھی بیان کر سکتے ہیں کہ چونکہ چائے حال ہی کی ایجاد ہے اس لئے اس کو حرام نہیں کیا جا سکا' بہر حال ہم کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہم تو ایک ایسی چیز کو اپنی شراب بنائے ہوئے ہیں جو شراب ہے لیکن حرام نہیں اور اس کو پینے کے بعد بھی ہمارا یہ حال ہے کہ

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

چائے جو سچ مچ کی چائے ہے وہ تو ایک ہی ہے یہ اور بات ہے کہ مشرقی اچھوانی پینے والوں نے چائے کی بھی متعدد قسمیں پیدا کر دی ہیں۔ ہری چائے' کشمیری چائے' دیسی چائے اور انگریزی چائے اور انہیں اقسام کی بنا پر چائے کی متعدد خصوصیات بھی قرار دے دی گئی ہے۔ مثلاً چائے کی خصوصیات میں سے یہ فارسی قسم کی خصوصیتیں ہیں کہ چائے لب بند' لب ریز' لب سوز ہو لیکن کشمیری چائے میں یہ تین صفات ایک اضافے کے بعد چار ہوجاتی ہیں یعنی لب بند' لب ریز' لب سوز اور لب دھر کہ اس کو بالائی کے ملغوبے سے خدا

جانے کیا بنا دیا جاتا ہے وہ چائے کیا ہوتی ہے ایک قسم کا میٹھا سالن ہوتا ہے جن میں سینکڑوں قسم کے تو مسالے ڈالے جاتے ہیں اور جوش اس قدر دیا جاتا ہے کہ گویا گوشب دیگ تیار ہو رہی ہے شیرینی کا یہ حال ہوتا ہے کہ گویا امرتیوں کا قوام ڈالا گیا ہے اور ان ترکیبوں سے تیار ہو کر جو چیز بنتی ہے اس پر وہ لوگ چائے کی تہمت لگاتے ہیں او اسی کی یہ خصوصیات قرار دی گئی ہیں کہ لب ریز، لب بند، لب سوز ہو لیکن ہماری خاطر سے ایک خصوصیت کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ لب دھڑ ہو لیکن یہ چائے اگر کسی حقیقی چائے نوش کو پلا دی جائے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر فوراً حضرت ریاض کا شعر اس طرح پڑھے گا۔

ارے بیرا ذرا لپٹن کی چائے دم تو کر لانا
یہ دیسی چائے بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

اس کو تو خیر ہم نے میٹھا سالن عرض کیا ہے لیکن لوگ چائے کو سچ مچ سالن بنا کر استعمال کرتے ہیں، یعنی نمکین چائے پیتے ہیں اور اس نمکین چائے کو جس وقت شیرمال ڈال کر پیتے نہیں بلکہ کھاتے ہیں اس وقت بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیرماں نہاری سے کھائی جا رہی ہے اور واقعی وہ لوگ چائے کو نہاری کا بدل سمجھتے ہیں ورنہ کہاں چائے، کہاں اس میں نمک اور کہاں شیرمال سے اس کو کھانا، ہم کو تعجب ہے کہ یہ لوگ چائے میں گوشت ڈال کر باقاعدہ چائے کا سالن کیوں نہیں پکاتے اور جو ذرا سی کسر رہ گئی ہے اس کو بھی کیوں نہیں پورا کر دیتے لیکن بغیر گوشت ڈالے بھی وہ نمکین چائے کم از کم ہماری اور ہماری طرح کے دوسرے چائے نوشوں کی نظروں میں تو قورمہ ہی ہے اور تمام دنیا کے متعلق ہم کچھ نہیں عرض کر سکتے۔ اسی ایک قسم پر کیا منحصر ہے چائے کی تو ایسی ایسی قسمیں ہیں اور اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ خود سر طامس لپٹن مالک لپٹن کمپنی لمیٹڈ کے فرشتوں کو بھی ان کا علم نہ ہوگا۔ ان بے شمار اقسام میں سے بہت سی ایسی ہوتی ہیں جن کو کہا تو جاتا ہے چائے لیکن خدا جانے وہ منجن ہوتی ہیں یا کیا بلا؟ بہرحال ہم ان کو چائے تو کہہ نہیں سکتے اگر ان بے شمار اقسام کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو شاید ہماری عمر کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہو جائے گا خیر اس میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ اس کے باوجود ہم اپنے کام کو تکمیل تک نہ پہنچا سکیں گے بہرحال بعض موٹی موٹی قسمیں تو ایسی ہیں جنکے متعلق کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

ہماری آپ کی طرح چائے کے بھی مذہب ہوتے ہیں یعنی ہندو چائے، مسلمان چائے وغیرہ، ریل کے بڑے بڑے سٹیشنوں پر تو خیر چائے کی علیحدہ علیحدہ دکانیں ہوتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے ''مسلمان چائے'' یا ہندو چائے'' وغیرہ لیکن جن سٹیشنوں پر دکانیں نہیں ہیں وہاں بھی گاڑی کے ٹھہرتے ہی یہ آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ''ہندو چائے گرم'' ''مسلمان چائے گرم'' وغیرہ۔ اور ان دونوں

قسم کی چائے کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ چائے ہندو چائے ہے اور یہ چائے مسلمان چائے' آپ ہندو چائے لیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ دھوتی باندھتی ہے یعنی آبخورے میں ہوتی ہے اسی طرح مسلمان چائے ملاحظہ فرمائیں تو وہ پاجامہ اور شیروانی وغیرہ میں نظر آئے گی یعنی پرچ' پرچ کے اوپر پیالی اور پیالی میں پڑا ہوا چمچہ' ان دو قسم کی چائے کے علاوہ اگر آپ عیسائی مذہب کی چائے ملاحظہ فرمائیں گے تو وہ سوٹ میں ہوگی یعنی کوٹ' پتلون' واسکٹ' ہیٹ وغیرہ میں۔ پرچ پیالی علیحدہ' دودھ دان الگ' شکر دان الگ' کیتلی الگ' ٹوسٹ الگ' مکھن الگ' چمچہ الگ' چھری الگ' بہرحال ہر مذہب کی چائے علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے اور ہر چائے کی وضع قطع بھی جداگانہ' یہ تو گویا چائے کی دو مستقل قسمیں ہیں جن میں مذہبی اختلاف ہے لیکن ایسی قسمیں بھی ہیں جن میں صرف معاشرتی اختلاف ہے لیکن وہ مذہبی اختلاف سے زیادہ شدید' لکھنو کی شعر بار فضاؤں میں جاڑوں کے شروع ہوتے ہی ایک طرف تو گلی کوچوں تک میں چائے کی دکانیں کھل جاتی ہیں اور دوسری طرف۔

نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر!

کی تعداد میں سینکڑوں چائے والے ہر طرف گشت کرتے ہیں ان کے پاس ایک بالٹی میں کچھ چائے کی پیالیاں پانی میں پڑی ہوئی اور اس پر ایک تھالی رکھی ہوتی ہے جس پر تھوڑی سی بالائی اور کچھ سموسے ہوتے ہیں' دوسرے ہاتھ میں چائے کو گرم رکھنے والا سماوار ہوتا ہے اور وہ لکھنو کے چائے فروش اپنے شہر کی شعریت سے متاثر ہو کر عجیب وغریب طرح چائے بیچتے ہیں مثلاً ایک چائے والے صاحب کا شعر ملاحظہ ہو۔

سموسہ مرا خستہ بالائی نرم ہے
تم پی لو میرے دوستو کیا چائے بھی گرم ہے

اس شعر کے نقائص نہ ڈھونڈھیے' صرف یہ دیکھئے کہ ایک چائے والے کا شعر ہے اور دونوں مصرعے نہ صرف موزوں ہیں بلکہ ایک ہی بحر میں ہیں نرم کا قافیہ گرم بھی ہے اور یہ شعر نہ صرف شعر ہے بلکہ مطلع ہے ان چائے والوں کی اور چائے کی دکانوں کی چائے میں بہت کم فرق ہوتا ہے اور دونوں کا تقریباً یہ حال ہوتا ہے کہ گرم اس قدر گویا سیال جہنم پی رہے ہیں شیریں اس قدر گویا فرہاد بھی نہ برداشت کر سکے یعنی حلق سے معدہ تک ایک سلاخ ڈالتے ہوئے چلی جائے اور ایک مرتبہ اس چائے کا پینے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذیابیطس میں مبتلا ہو جائے۔ رنگ شروع میں سرخی مائل ہوتا ہے لیکن جب پکتے پکتے چائے گاڑھی ہو جاتی ہے تو نیلا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات سیاہ بھی ہوتا ہے گھبرانہ سی ہلکا سی ہمارا تو خیال ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ چائے مثانہ کمزور کرتی ہے اور چائے خشکی

پیدا کرتی ہے اور چائے سے اختلاج ہوتا ہے وغیرہ۔ اگر انہوں نے اس چائے کے متعلق فرمایا ہے تو اب ہم کہتے ہیں کہ بالکل بچ فرمایا ہے بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ یہ چائے خواہ کوئی مرض پیدا کرے یا نہ کرے لیکن اچھے خاصے تندرست کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ اس چائے کو تو چھوڑنا نہیں بلکہ حرام قرار دے دینا چاہیے اور حکومت کو چاہیے کہ حفظان صحت کے خیال سے اس پر پابندی عائد کر دی جائے کہ کوئی شخص بغیر لائسنس حاصل کئے اس کو بیچ نہ سکے۔ اس لئے کہ اس چائے میں اور زہر میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے ایک چائے وہ ہوتی ہے کہ جس کو طلسم ہوشربا' بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ یا الف لیلہ وغیرہ پڑھنے والے اس طرح پیتے ہیں کہ بیچ میں چائے کا پتیلا چڑھا ہوا ہے اور چاروں طرف حلقہ کئے وہ مریدان چینا بیگم بیٹھے ہوتے ہیں چائے کا دور چلتا جاتا ہے اور ادھر گھلتی بھی جاتی ہے مکھیوں کی چہل پہل میں یہ دنیا سے بے نیاز خدا کے بندے کچھ اس محویت سے چائے پیتے ہیں کہ گویا چائے ان پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ چائے میں ڈوب جاتے ہیں اگر نقش و نگار ہوئے تو خیر ورنہ مکھیاں خود نہایت باریک نقش و نگار بنا دیتی ہیں اور اگر پیالیاں نہ بھی ہوں تو وہ تام چینی کے داغدار ڈونگوں سے ورنہ مٹی کے کلھڑوں سے کام نکال لیتے ہیں مطلب تو چائے سے ہے اور سچ تو یہی ہے کہ

یہ اہتمام نہیں کفر چائے نوشی ہو
جو چائے ہو تو ضرورت نہیں ہے پیالی کی

چائے کی ایک اہم قسم مشاعروں اور مجلسوں کی چائے بھی ہے جو تقریباً ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اس چائے کو اگر چائے کہہ کر نہ پلایا جائے تو ممکن ہے کوئی لطف آ جائے لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ چائے پلائی جا رہی ہے تو بس غصہ ہی آ جاتا ہے کہ لونگ اور جاوتری وغیرہ کی خوشبو خود اعلان کرتی ہے کہ اگر یہی مسالہ جو چائے میں ڈالا گیا ہے تھوڑا سا بھونا جوش دینے کے بعد اس میں ملا دیا جاتا تو شاید وہی مزہ ہوتا جو اس چائے کا ہوتا ہے۔ اگر یقین نہ آتا ہو تو تھوڑی سی آٹے کی بھوسی کو پانی میں جوش دے کر اس میں اسی نسخہ کے اجزا ڈال دیئے جائیں جو مشاعروں اور مجلسوں کی چائے میں ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس کو پی کر دیکھا جائے اگر ذرا بھی فرق ہو تو جب ہی کہیے گا۔ اسی طرح میونسپل الیکشن کے زمانے میں امیدواروں کی طرف سے ووٹروں کو جو چائے ملتی ہے وہ بھی یقیناً شیرمال کے ساتھ لذیذ چیز ہوتی ہے۔ لیکن چائے نہیں ہے بہر حال دونوں میں سے ایک ہے اور دوسری نہیں۔

خیر ہم کو ان دنیا بھر کی مختلف چائے کی قسموں سے کیا غرض ہم تو اسی کو چائے سمجھتے ہیں۔ ''جس کا قرپہ دم نکلے'' اور وہی ہماری زندگی کا سہارا ہے۔ خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے اگر ہم کو چائے نہ ملے تو شاید دنیا والوں کو پھر ہم بھی نہیں مل سکتے۔

اگر کبھی اتفاق سے چائے کے مقررہ اوقات یعنی صبح سات بجے اور شام کو پانچ بجے میں ذرا سی بھی تبدیلی ہو جاتی ہے تو بس جان ہی پر بن جاتی ہے وہ عالم ہوتا ہے کہ خدا وہ وقت دشمن کو بھی نہ دکھائے مثلاً رمضان شریف میں روزہ رکھ بیٹھے۔ اب صبح سات ہی بجے سے یہ عالم ہوگا کہ گویا رگ رگ کی روح کھینچ لی گئی ہے۔ جماہیوں پر جماہیاں آئیں گی ہاتھ پیروں میں کمزوری محسوس ہوگی، طبیعت نڈھال ہو جائے گی، تھوڑی دیر کے بعد سر گھومنا شروع ہوگا پھر درد سر شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ شام کے وقت ہم بالکل عالم نزع میں نظر آئیں گے لیکن عین دم نکلنے سے قبل یعنی مغرب کے وقت جیسے ہی اذان ہوگی ہم خود بخود یہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں گے کہ

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

اور فورائی کوزی ہٹا کر کیتلی سے اس دو آتشہ ارغوانی رنگ والی چائے کو پیالی میں انڈیلیں گے اس میں شکر ڈالیں گے اور دودھ ملا کر اس ارغوانی رنگ کو سنہرا رنگ بنا دیں گے اس کے بعد اس کا پہلا ہی جرعہ حلق سے اترتے ہی تمام دن کی کلفت خواب وخیال کر دے گا کہ جیسے آب حیات اٹھا کر پی لیا رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ گویا خدا نے حیات تازہ بخشی ہے یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب تمام دن بغیر چائے کے تشنہ لبی میں گزرا ہو لیکن روزانہ یہی ہوتا ہے کہ صبح اٹھتے ہی اس کافرہ کی یاد ستاتی ہے اور جب تک وہ کیتلی کی پری نظروں کے سامنے نہیں آتی بلکہ جب تک ہم اس کیتلی کی پری کو حلق کے نیچے نہیں اتار لیتے صبر نہیں ہوتا، اس کو چاہے ہمارا عشق سمجھئے یا چائے کا حسن۔ بہر حال ہم اس بات کے سختی سے قائل ہیں کہ اگر جنت میں چائے نہیں ہے تو پھر واقعی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت کیا ہے

لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے فطرت نے ایسی فاش غلطی یقیناً نہ کی ہوگی کہ جنت میں چائے نہ رکھی ہو بلکہ جہاں تک دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی اسی کے قریب چائے کا آبشار بھی ہوگا ورنہ اس جنت سے جس میں چائے نہ ہو وہ سٹیشن ہزار درجہ اچھے ہیں جن پر ہندو چائے اور مسلمان چائے ہوتی ہے خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں معلوم نہیں کیا ہو۔

اب تو ہم چائے خوب پیتے ہیں
عاقبت کی خبر خدا جانے

لیکن اس کو ہماری وصیت سمجھ کر ہمارے تمام اعزا تمام دوست تمام دشمن، اس مضمون کو پڑھنے والے بلکہ تمام برادران ملک وملت جناب صدر معزز خواتین اور حاضرین جلسہ سب نوٹ کر لیں کہ ہمارے مرنے کے بعد بلکہ ابھی سے اگر وہ لوگ وقتاً فوقتاً ایک پیالی

چائے پر ہمارا فاتحہ پڑھ دیا کریں گے تو خدا ان کو نیک اجر دے گا ورنہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ قیامت کے دن سب کا دامنگیر ہونا ہمارے بس کی بات نہیں، لیکن ہم اپنی وصیت کا جو دوسرا حصہ پیش کرنے والے ہیں وہ یقیناً اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کو بھی ہمارے پس ماندگان نے یوں ہی ٹال دیا تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ اچھا نہ ہوگا اور اس صورت میں ہم یقیناً مجبور ہوں گے کہ حشر کے دن ہمارا ہاتھ ہو گا اور ہماری وصیت کے ٹالنے والوں کا گریبان یا دامن جو کچھ بھی مل جائے وہ وصیت یہ ہے کہ ہم چاہے جس گوشہ دنیا میں راہی ملک عدم ہوں لیکن سب سے پہلے تو یہ کوشش کی جائے کہ ہمارے جسد اطہر کو آسام لے جایا جائے اور وہاں دریائے ارادوی کے کنارے والے چائے کے باغوں میں کوئی بہتر جگہ تلاش کر کے ہم کو سپرد خاک کیا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو دارجلنگ، ٹراونکور، کانگڑہ، جل پیگڑی، میسور، چھوٹا ناگپور، چٹا گانگ اور اوٹا کمانڈیا، نیلگری وغیرہ میں سے کہیں ہماری درگاہ شریف بنائی جائے جس کے مجاور اب سے لے کر قیامت تک لپٹن کمپنی کا ہر ہونے والا مالک ہوا کرے یاد رکھئے کہ صرف یہی ایک ترکیب ہے جس سے ہماری روح اب بھی خوش رہ سکتی ہے اور جب بھی خوش رہے گی۔

◆◆◆

ماسٹر صاحب

"آخر یہ کب تک یوں ہی گلی ڈنڈا اڑاتا پھرے گا؟ تم کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے کہ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے اگر کچھ دن اور کھیل کود میں پڑا رہا تو بس پھر پڑھ چکا۔

والدہ صاحبہ نے اس خاکسار کے متعلق یہ الفاظ والد صاحب سے اس وقت کہے جب وہ بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے رات کو حقہ پیتے پیتے سو جانے کے قریب تھے چنانچہ انہوں نے گویا چونک کر جواب دیا۔

"ایں کیا کہا؟ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے؟ حالانکہ اب تعلیم کا زمانہ آیا ہے بہر حال میں خود اس فکر میں ہوں کہ کوئی معقول سا ماسٹر مل جائے تو اس کو پڑھنے بٹھا دوں۔"

اس کے بعد ماسٹر کی نوعیت اور ماسٹروں کی جملہ اقسام کے متعلق دونوں میں بحث ہوتی رہی یہاں تک کہ والد صاحب تو صرف جماہیاں لیتے رہے مگر ہم سنتے سنتے سو گئے اور پھر ہم کو نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد ایک چرکٹ قسم کا ادھیڑ عمر انسان بحیثیت ماسٹر کے والد صاحب خدا جانے کہاں سے پکڑ لائے اور ہم کو ان حضرت کے سپرد کر دیا۔

یہ ماسٹر وضع قطع کے اعتبار سے ہمارے سائیس گنگو کے بھائی بند معلوم ہوتے تھے اور کچھ ایسی رونی صورت پائی تھی کہ اگر یہ بے چارے بجائے ہم کو پڑھانے کے بھیک مانگتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ بہر حال اب تو وہ ماسٹر ہی تھے اور ہم ان کے شاگرد رشید لہٰذا ہم نے ان سے شرف تلمذ حاصل کرنا شروع کر دیا او مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈر کے علاوہ کنگ پرائمر کا سبق بھی لینے لگے۔ اگر استاد قابل اور شاگرد ذہین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ چار پانچ مہینہ کے اندر ہم نے اردو ریڈر بھی بفضلہٖ ختم کر دی اور کنگ پرائمر کے پندرہ سولہ صفحے پڑھ ڈالے اس کے علاوہ اے بی سی ڈی مختلف طریقوں پر لکھنا سیکھ گئے اور سو تک کے ہندسے اردو اور انگریزی میں لکھنا سیکھ لئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ چار پانچ مہینہ میں اس سے زیادہ ایک ماسٹر اور کیا پڑھا سکتا تھا اور ایک ذہین شاگرد اور کیا پڑھ سکتا تھا؟ مگر باوجود ماسٹر صاحب کی اس محنت اور ہماری اس ذہانت کے والدہ صاحبہ کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ ماسٹر صاحب کچھ پڑھاتے وڑھاتے نہیں ہیں اور ہمیشہ جلدی چھٹی دے دیا کرتے ہیں حالانکہ ان

کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ جس سبق کو دوسرے ماسٹر گھنٹوں میں پڑھایا کرتے ہیں اور سبق ہمارے ماسٹر صاحب منٹوں میں پڑھا دیتے ہیں اور وہی سبق جس کو کودن قسم کے لڑکے گھنٹوں رٹتے ہیں ہم چند منٹ میں پڑھ کر پھینک دیتے تھے' پھر اس کے بعد آخر اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہم خواہ مخواہ بیٹھے چکی پیسا کرتے اور ماسٹر صاحب بلاوجہ ہم کو گھنٹوں رٹاتے۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ ماسٹر صاحب تھے تو اچھوت اقوام میں سے مگر بڑی شریف طبیعت پائی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا ایسا ماسٹر بھی قسمت ہی سے کسی شاگرد کو مل سکتا ہے یہ بے چارے ہم کو دو گھنٹہ روز پڑھانے پر ملازم تھے مگر ہم کو تو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھایا ہو اور وہ بھی اس طرح کہ پہلے تو آتے ہی ہم کو اردو ریڈر کا سبق اس طرح پڑھایا کہ خود پڑھتے گئے اور ہم سب سے کہا کہ آواز سے آواز ملا کر تم بھی پڑھتے جاؤ۔ چنانچہ ماسٹر صاحب کتاب دیکھ کر پڑھتے تھے اور ہم ماسٹر صاحب کا منہ دیکھ کر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہراتے تھے اس کے بعد کل کا سبق اس طرح سنتے تھے کہ ہمارے آگے کتاب رکھ دی اور کہا سناؤ سبق' ہم کبھی دیکھتے اور کبھی ماسٹر صاحب کا منہ اس کے بعد وہ خود ہی کہتے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

ماسٹر صاحب خوش ہو کر کہتے تھے۔ شاباش! ہاں اور آگے۔

اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

ہم پھر ماسٹر صاحب کی آواز سے آواز ملا کر یہ شعر بھی پڑھ دیتے تھے لیجئے قصہ ختم گویا سبق یاد ہے اس کے بعد اسی طرح کنگ پرائمر کا سبق پڑھایا اور سنا جاتا تھا' پھر ماسٹر صاحب سلیٹ ہمارے سامنے رکھ کر ہمارا ہاتھ جس میں سلیٹ کی پنسل ہوتی تھی قلم کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر گنتی لکھنا شروع کرتے تھے اور کوئی پانچ ہی منٹ میں یہ کام بھی ختم ہو جاتا تھا مختصر یہ کہ آدھ گھنٹے کے اندر اردو' انگریزی اور حساب کی مکمل تعلیم ہو جاتی تھی' اس کے بعد نہ ہمارا پڑھنے میں دل لگتا تھا نہ ماسٹر صاحب بلاوجہ چکی پسوانے کی تائید میں تھے چنانچہ دو گھنٹے کا کام آدھ گھنٹے میں پورا کرنے کے بعد ہم کو اور ماسٹر صاحب کو دونوں کو چھٹی مل جایا کرتی تھی اور یہی بات والدہ صاحبہ کو ناگوار ہوتی تھی وہ غالباً یہ چاہتی تھیں کہ ماسٹر صاحب مسلسل دو گھنٹے تک خواہ مخواہ پڑھاتے رہیں اور ہم بلاوجہ دو گھنٹے تک پڑھ کر اچھے خاصے دماغ کو خراب کر لیں۔ چنانچہ روز جب ہم پڑھ کر گھر میں جاتے تھے ہم سے یہی سوال ہوتا تھا کہ "بس پڑھ چکے کیا

ماسٹر صاحب گئے' اور جب ہم یہ کہتے کہ ہاں پڑھ چکے اور ماسٹر صاحب بھی گئے تو والدہ صاحبہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ خدا جانے یہ ماسٹر اتنی دیر میں سبق گھول کر پلا دیتا ہے یا کیا کرتا ہے کہ آتے دیر نہیں ہوئی اور پڑھا لکھا کر چھٹی بھی دے دی۔"

بہر حال ہماری تعلیم جاری تھی اور ہم فاضل ہو جانے کے قریب ہی تھے کہ ایک دن والد صاحب کو بھی ذرا ہماری تعلیم کا خیال آیا اور انہوں نے ہم کو پاس بلا کر پوچھا۔

"تم نے انگریزی کہاں تک پڑھ لی؟"

ہم نے کہا۔ "آدھی کتاب پڑھ چکے ہیں۔"

والد صاحب نے اپنا انگریزی اخبار اٹھا کر ایک موٹے سے حرف پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کونسا حرف ہے؟"

ہم نے اس حرف کو گھور کر دیکھا اور غور کرنا شروع کیا کہ یہ کونسا حرف ہو سکتا ہے؟" مگر کافی غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ خواہ کوئی بھی حرف ہو بہر حال ہماری کتاب میں نہیں ہے اور نہ ہم نے اب تک اس کو کہیں دیکھا ہے' والد صاحب نے پھر کہا "بتاؤ یہ کونسا حرف ہے۔"

ہم نے جواب دیا "یہ حرف تو ہم نے نہیں پڑھا۔"

والد صاحب نے کہا۔ "ایں کیا کہا' یہ حرف تم نے نہیں پڑھا اور آدھی کتاب پڑھ گئے۔ اچھا یہ کونسا حرف ہے۔" ایک اوپر کے حرف پر والد صاحب کی انگلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ حرف بھی کچھ عجیب قسم کا تھا گویا چائے کی پیالی کا ٹوٹا ہوا کنڈا۔ ہم نے اسے غور سے دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں نہیں معلوم" والد صاحب نے طنز کے ساتھ کہا "ماشاء اللہ خوب' آپ نے آدھی کتاب پڑھی "اچھا یہ کیا ہے؟" ایک تیسرے حرف پر والد صاحب نے انگلی رکھ دی۔ یہ حرف بالکل ڈلی کاٹنے کے سروتے کی طرح کا تھا اور غالباً حرف نہیں تھا بلکہ سروتا ہی تھا لہٰذا ہم نے کہا "سروتا ہے" والد صاحب نے حیرت سے کہا' کیا کہا۔۔۔۔۔۔۔سروتا ہے' سروتا کیا؟" ہم نے والد صاحب کی محدود معلومات پر ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کو معلوم نہیں سروتا کس کو کہتے ہیں' جس سے ڈلی کاٹی جاتی ہے۔" والد صاحب نے ہم کو اور اس حرف کو یکے بعد دیگرے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈلی کاٹنے کا سروتا ہے کیا تمہارے ماسٹر نے یہی تم کو بتایا ہے؟" ہم نے کہا' نہیں ماسٹر صاحب نے تو نہیں بتایا میں خود کہہ رہا ہوں۔ والد صاحب نے کہا۔ "اچھا اپنی سب کتابیں لاؤ"

ہمارے اس امتحان سے والدہ صاحبہ کو بھی گویا دلچسپی ہو رہی تھی' چنانچہ وہ بھی گھر کا دھندا چھوڑ کر وہیں بیٹھی ہوئی تفریح فرما رہی تھی اور بیچ بیچ میں والد صاحب کو بھرتی جاتی تھیں کہ "کسی دن ان ماسٹر صاحب نے آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھایا اور میں تو سمجھتی ہوں

کہ یہ ماسٹر پڑھاتے وڑھاتے نہیں یوں ہی وقت خراب کر رہے ہیں وغیرہ۔

بہرحال ہم اپنی کتابیں لے آئے اور کنگ پرائمر لے کر پوچھنا شروع کیا۔ ”ریٹ معنی؟“

ہم نے جلدی سے کہا۔ ”ایم اے این ریٹ معنی آدمی“

والد صاحب نے ذرا تیز آواز میں پوچھا ”ایم اے این ریٹ ہوا؟“

ہم نے گھبرا کر جی جی نہیں۔ ایم اے این شاید کیٹ ہوا' کیٹ معنی بلی“

والد صاحب نے کنگ پرائمر رکھ کر کہا ماشاء اللہ خوب' ان ماسٹر صاحب نے پڑھایا ہے اور خوب آپ نے پڑھا ہے۔۔۔۔۔ اچھا ذرا اردو کی وہ کتاب تو لائیے جو آپ ختم کر چکے ہیں۔“

ہم نے کتاب دے دی اور والد صاحب نے کتاب کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی کہ پڑھو مگر آپ ہی بتائیے کہ یہ بھی پڑھنے کا کوئی طریقہ تھا کہ ہم خود بخود پڑھنے لگیں ہم نے تو اب تک اس قسم کا پڑھنا پڑھا تھا کہ کوئی پڑھے تو ہم آواز سے آواز ملا کر اس کے ساتھ پڑھیں لہٰذا اس موقع پر ہم چپ ہو رہے اور انتظار کرنے لگے کہ اب والد صاحب پڑھیں گے اور ہم کو آواز سے آواز ملا کر پڑھنا پڑے گا مگر بجائے اس کے کہ وہ پڑھتے' انہوں نے پھر کہا ”پڑھو بھائی پڑھتے کیوں نہیں' یہ کتاب تو تم ختم کر چکے ہو“

ہم نے کہا ”جی ہاں' یہ تو بہت دن ہوئے ختم ہو گئی' آپ پڑھیئے تو میں بھی پڑھوں۔“

والد صاحب نے کہا ”میں پڑھوں یعنی میں؟ کیا مطلب اس سے۔“

ہم نے کہا ”جی ہاں آپ پڑھئے گا جب ہی تو ہم پڑھیں گے۔“

والد صاحب نے انتہائی حیرت سے کہا۔ ”میں پڑھوں گا جب تم پڑھو گے یہ کیا؟“

والد صاحب نے انتہائی حیرت سے پوچھا ”تو کیا تم کو اسی طرح پڑھایا گیا ہے؟“

ہم نے کہا ”جی ہاں ہم کو ماسٹر صاحب نے اسی طرح……“ اتنے میں ماسٹر صاحب نے باہر سے آواز دی اور والد صاحب نے ہم سے کہا کہ ”جاؤ ماسٹر صاحب آ گئے ہیں پڑھو جا کر۔“

ماسٹر صاحب کے آ جانے سے ہماری جان میں جان آئی اور والد صاحب سے نجات ملی۔ ہم ماسٹر صاحب کے پاس چلے گئے اور والد صاحب کوٹھے پر چلے گئے۔

ہم نے باہر جاتے ہی ماسٹر صاحب سے آج کے امتحان کا ذکر کیا' کہ کس طرح والد صاحب نے ہم سے انگریزی اخبار پڑھوانا چاہا اور کس طرح اردو پڑھوا رہے تھے اور اس کے بعد کل کا سبق سنانے بیٹھ گئے ماسٹر صاحب نے کہا۔ ہاں کل کا سبق سناؤ۔

''رات گزری نور کا تڑکا ہوا''

ہم نے کہا۔

''رات گزری نور کا تڑکا ہوا''

ماسٹر صاحب نے پڑھا۔

''ہوشیار سکول کا لڑکا ہوا''

ہم نے آواز ملا کر پڑھا۔

''ہوشیار سکول کا لڑکا ہوا''

چونکہ کل کا سبق ہم کو یاد تھا لہٰذا ہم کو نیا سبق دیا گیا اور پھر انگریزی کا سبق شروع ہوا۔ انگریزی کے بعد حساب اسی طرح سکھایا گیا کہ ہمارے ہاتھ میں پنسل تھی اور ہمارا ہاتھ مع پنسل کے ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھا اور سلیٹ پر سو تک کی گنتی لکھی جا رہی تھی گنتی ختم ہونے کے بعد ہی ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا'' اچھا اب جائیے۔''

ماسٹر صاحب نے کہا'' ابھی بیس ہی منٹ ہوئے ہیں اور پڑھو''

ہم کتابیں چھوڑ کر ماسٹر صاحب کی گردن میں لٹک گئے'' آپ بڑے اچھے ہیں آپ چھٹی دے دیجئے پھر ہم آپ کو پیسہ دیں گے۔''

ماسٹر صاحب نے کہا'' آج کتنے پیسے ہیں؟''

ہم نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا'' آج صرف تین ہیں ایک قرض رہا۔ مگر اب چھٹی دے دیجئے۔ یہ کہہ کر ہم پھر ماسٹر صاحب کی گردن میں لٹک گئے اور ان کی مونچھیں مروڑنے لگے۔

ماسٹر صاحب نے پیسے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔'' اچھا جاؤ اور خود بھی جانے کے لئے اٹھے ہی تھے کہ آواز آئی۔

''ماسٹر صاحب ذرا ٹھہریئے گا''

والد صاحب اوپر کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ ماسٹر صاحب ان کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور والد صاحب نے کوٹھے کے اوپر سے

اتر کر ماسٹر صاحب کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کل سے زحمت نہ کیجئے گا۔“

ہم کو ان ماسٹر صاحب کی جدائی کا تو چنداں افسوس نہیں ہوا مگر تین ہی چار دن کے بعد ایک دیوزاد ماسٹر صاحب ہم کو پڑھانے کے لئے مقرر کر دیئے گئے جن سے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں محض اس لئے خوش تھیں کہ وہ نوکر تو تھے دو گھنٹے کے لئے مگر ہم کو گھونٹا کرتے تھے سوا تین گھنٹہ تک اور وہ بھی خالی ہاتھ نہیں بلکہ قمچی کی مدد سے' بہرحال ان کی ان جفا کاریوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہم چائے کی پیالی کے کنڈے کو ”پی“ اور سروتے کو ”آر“ کہنے لگے۔

◆◆◆

جس کے لئے کیا سفر

خدا نہ کرے کہ کبھی کسی شریف مرد آدمی کو ریل میں یا سٹیشن پر یا مسافر خانہ میں یا ٹکٹ گھر کے قریب کسی سے عشق پیدا ہو جائے اس قسم کا عشق جس کا تعلق ریلوے سے ہو بیچارے عاشق کو بجائے ”صحرا بہ صحرا“ پھرانے کے ”سٹیشن بہ سٹیشن“ پھراتا ہے اور وہ تھرڈ کلاس کے زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے جھانک کر دل لے جانے والا جلوہ پھر مشکل ہی سے نظر آتا ہے اس لئے کہ وہ ریل ہوتی ہے جس کا کام چلنا کوئی جلوہ گہ ناز تو ہے نہیں کہ ایک ہی جگہ پر قائم رہے اور عشاق پس دیوار بیٹھے سر پھوڑا کریں۔ اس ریل کے عشق کا تو بس یہی علاج ہے کہ یا تو اس رہزن تمکین و ہوش کا ٹکٹ دیکھ کر اسی جگہ کا ٹکٹ خرید لیا جائے ”جو نیت امام کی وہی ہماری“ کہہ کر ساتھ ہو لئے یا پھر اسی ٹرین کے نیچے لیٹ کر جان آفریں کو جان سپرد کر دی جائے‘ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عشق کا حملہ ہتے ہی بیچارے عاشق کے ہوش و ہواس ہی کب قائم رہتے ہیں کہ اس پروگرام کو پیش نظر رکھ کر اس پر عمل کرے۔ نتیجہ یہی رہتا ہے کہ حسن تو بجلی گرا کر ریل کے ساتھ چھک چھک کرتا ہوا چل دیتا ہے اور بیچارہ عاشق پلیٹ فارم پر اس طرح تڑپتا ہے گویا ریل سے کچل کر جان دے رہا ہو اگر عشق نے زیادہ ستایا تو اسی سمت کو جانے والی کسی گاڑی پر خواہ وہ مال گاڑی کیوں نہ ہو بیٹھ کر عاشق اپنی خانماں بربادی بلکہ آوارہ گردی کی بسم اللہ کرتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی جی‘ آئی پی این ڈبلیو آر اور اسی طرح کی نہیں معلوم کتنی ریلوں میں سفر کرتے گزر جاتی ہے ”لیکن پھر دیکھ لوں اک بار میں جلوہ ترا“ کی تمنا بھی پوری نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اختر نے جھانسی کے سٹیشن پر دہلی سے بمبئی جانے والی ایکسپریس کی ایک ”پسنجر“ کو دل دے ہی دیا۔ اختر تھے تو ہمیشہ کے ”ہولو“ مگر ہم کو یہ امید نہ تھی کہ ان میں عشق و محبت کی صلاحیت موجود ہے۔ جب وہ حضرت ایکسپریس کے آنے کے بعد زنانہ درجہ کے سامنے بڑی دیر تک منہ اٹھائے کھڑے رہے تو ہم ان کی اس حرکت کو بھی ”ہولو پن“ سمجھے رہے لیکن جب ایکسپریس کے جانے کے بعد بھی وہ مجسمہ بنے کھڑے رہے تو ہم کو ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں ان پر فالج تو نہیں گرا ہے‘ کہیں ان کے قلب کی حرکت تو نہیں بند ہو گئی ہے۔ کہیں ان پر جادو کر کے کسی نے پتھر کا تو نہیں بنا دیا‘ کہیں یہ سردی کی شدت سے اکڑ تو نہیں گئے۔ یہاں تک کہ یہ شبہات رفتہ رفتہ بڑھنے لگے اور ہم پر ایک خوف کی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ ان کو چھونے کی بھی ہمت نہ ہوئی تھی‘ دور ہی سے کھڑے ہوئے آوازیں دے رہے تھے اگر سٹیشن ماسٹر کو اطلاع دیتے تو اندیشہ تھا کہ کہیں لاوارث مال سمجھ کر ان کو مال

گودام میں نہ ڈال دیا جائے اور خود اس لئے نہیں چھوتے تھے کہ کہیں ہم بھی ایسے ہی نہ ہو جائیں لیکن آخر یہ کب تک ہوتا یہ تو ہونے سے رہا کہ اس بے چارے کو چھوڑ کر چلے جاتے حالانکہ نئی روشنی کے دوستوں کا یہی فیشن ہے کہ وقت پڑنے پر بیگانہ بن جاتے ہیں لیکن ہم اس کو ذرا شرافت سے بعید سمجھتے ہیں لہٰذا دل مضبوط کر کے ان کی طرف بڑھے اور درود شریف وغیرہ پڑھ کر ان کے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا وہ چونک پڑے اور ان کے چونکنے سے ہم اچھل پڑے انہوں نے ایک ''ارمہریری سانس'' کھینچ کر کہا ''کیا ایکسپریس چھوٹ گئی؟'' ان کے اس سوال سے ہم کو اندیشہ ہوا کہ بچارے کا دماغ خراب ہو گیا' لہٰذا ہم نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہ کہیں حملہ نہ کر بیٹھیں کہا ''کیا تم سو رہے تھے؟''

اختر: ''کیا تم سو رہے تھے؟''

میں: ''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم سو رہے تھے؟ جو ایکسپریس کے چھوٹنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔''

اختر: ''واقعی میں سو رہا تھا میں نے خواب دیکھا وہ خواب میں تھی وہ خواب تھی''

میں: ''عجیب چیز ہیں آپ بھی یعنی گھنٹہ بھر سے منہ اٹھائے کھڑے ہیں' گویا بنا کر کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔''

اختر: ''ہاں بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوں دیوانہ بنا کر سودائی بنا کر' وحشی بنا کر' مجنون بنا کر۔''

میں: ''پاگل تو ہو ہی اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے آخر تم ہی بتاؤ یہ کونسی ادا تھی؟''

اختر: ''ادا ہاں ادا تھی جو میرے قضا بنے گی اور جس کو میں بقا سمجھونگا۔'' اب تک تو ہم مردبنے ان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنا کئے' لیکن اب ایسی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ اگر وہ ہماری طرف بڑھتے تو ہم چیخ مار کر یا تو بھاگ جاتے یا بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے لیکن ہم نے اپنے آپ کو اور بھی مضبوط کیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر ذرا تھرائی ہوئی آواز سے دریافت کیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔''

اختر: ''اچھا وہ کون تھی؟''

میں: ''کون؟''

اختر: ''وہ جو گئی ہے۔''

میں: ''بمبئی دہلی ایکسپریس تھی۔''

اختر: نہیں وہ غارت گر ایمان جو اس میں بیٹھی تھی جو مجھ کو اپنا بنا کر یہیں چھوڑ گئی جو چلتے وقت مجھ سے ملی بھی نہیں جس نے ادھر رخ

بھی نہ کیا جو مجھ کو اپنا بنا کر جانتی بھی نہیں۔

''ہائے جسے خبر نہیں کچھ مرے حال زار کی''

میں: ''کیا ہوا کیا؟ کس کو تم کہہ رہے ہو؟ میں ابھی نہیں سمجھا''

اختر: ''وہی میرے دل کی مالکہ''

میں: ''کیا کوئی عورت تھی۔''

اختر: ''ہاں ایک کافرہ تھی ایک حور تھی ایک مست شباب تھی جس کی ایک بہکی ہوئی نظر میرا دل چھین لے گئی اور جس نے مجھ کو تڑپا کر ایک نظر بھی نہ ڈالی۔''

اور اس خطرناک عشق جس کو ہم مہلک ترین عشق یعنی ''ریلوے عشق'' سمجھتے ہیں۔

خیر ہمارا خوف تو دور ہوا مگر بیچارے اختر کی حالت پر ہم نے افسوس ہی نہیں کیا بلکہ ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' بھی پڑھ دیا اس لئے کہ اب ہماری نظروں کے سامنے ان کا مستقبل موجود تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر واقعی ان حضرت نے دل دیا ہے تو اب ان کا علاج پاگل خانے میں بھی نہیں ہو سکتا ہم ان کے قریب آئے ان کے سر سے ٹوپی اتار کر ہوا دی لیکن جب وہ ہوا لگنے سے سردی کی شکایت کرنے لگے تو ہم نے ان کو تسلی دی، کامیابی کے سبز باغ دکھائے اور دل بہلانے کی ترکیبیں کرتے رہے لیکن وہ یہی پوچھا کئے کہ ''آخر وہ کون تھی؟''

عشق کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہ چلا گیا جو بیچارے ان عاشقوں کو زندگی بھر سمجھاتے ہیں ان ہی کا دل خوب جانتا ہوگا کہ ان لوگوں سے کتنا سر کھپانا پڑتا ہے اور یہ لوگ سمجھانے سے کتنا بگھتے ہیں واللہ عجیب بات ہے کہ یہ عاشق لوگ جو بات کہی جائے اس کا الٹا ہی مطلب ہمیشہ سمجھا کرتے ہیں اور سمجھانے والے سے بڑھ کر دنیا میں ان لوگوں کا دشمن اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو ''ناصح نادان'' کہتے ہیں۔ اس کو اپنی زبان میں طرح طرح کی مہذب گالیاں دیا کرتے ہیں اور اس سے ایسا جلتے ہیں گویا یہ بھی رقیب ہے۔ تقریباً یہی حال ہمارا تھا کہ ہم اپنے نو گرفتار عشق اختر کو سمجھانا چاہتے تھے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہمارا دوست ہے اور مجمع احباب میں اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو تاش کی گڈی میں جوکر کو' تھیٹر میں کومک کو یا اخباروں میں پنچ اخبارات کو حاصل ہوتا ہے اور اگر کہیں وہ عشق کا دیوانہ بن کر جان پر کھیل گیا تو ہمارا لطف زندگی بھی باقی نہ رہے گا لیکن وہ حضرت ہمارے اس جذبہ کی قدر یہ فرما رہے تھے کہ ہم کو خود غرض ابن الوقت' احمق' طوطا چشم' غیر ہمدرد' نامعقول' بیوقوف اور اس قسم کی جتنی معزز گالیاں ہو سکتی ہیں

سب دے رہے تھے وہ تو کہئے کہ ہم ان کو مرفوع القلم سمجھ چکے تھے ورنہ یہ عشق وشق تو سب دھرا رہ جاتا پلیٹ فارم پر اچھی خاصی فوجداری ہو جاتی اور انصاف سے دیکھئے تو فوجداری کی بات بھی تھی کہ آپ کسی شریف آدمی کو برا بھلا کہیں اور وہ خاموش رہے یہ کیسے ممکن ہے' ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے تو ان سے کہا کہ ''بھائی جو کچھ ہونا تھا ہوا' اگر وہ موجود ہوتی تو پولیس وغیرہ کے سپرد کر دیتے اور اگر اس کے پاس سے تمہارا دل برآمد کر لیتی تو تم کو دل مل جاتا اور اس کو سزا ہو جاتی لیکن اب تو وہ ہے ہی نہیں لہٰذا اب جانے دو' چھوڑو اس قصہ کو اور چلو گھر'' اب بتایئے کہ ہم نے ان سے کونسی غیر شریفانہ بات کہی' لیکن وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے ''آپ کی ہمدردی کا شکریہ' آپ تشریف لے جایئے میں آ جاؤں گا'' سچ ہے۔

جس پہ گزری ہو یہ وہی جانے
جو کہ بیدرد ہو وہ کیا جانے

میں: ''تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں؟ جو کہو وہ کروں' اب تو جو کچھ گزرنا تھی گزر چکی اب صبر کرو خداوند کریم نعم البدل دے گا۔''

اختر: ''نعم البدل اور اس کا' ناممکن ہے اور اگر ممکن بھی ہو تو مجھ کو منظور نہیں''

میں: ''اچھا تو پھر اب کیا کیا جائے۔''

اختر: ''کچھ نہیں' بس مجھ کو چھوڑ دو' میں اسی طرف جاؤں گا' جدھر میرا دل لے جایا گیا ہے۔''

میں: ''یعنی ریل کی پٹری پٹری چلے جاؤ گے اچھا پھر۔''

اختر: ''مجھ کو پھر کے بعد کچھ معلوم نہیں بہرحال مجھ کو چھوڑ دو۔''

میں: ''ذرا صبر سے کام لو دیوانگی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔''

اختر: ''بھائی صاحب تو آپ اپنی صحیح الدماغی کو لئے دولت کدہ تشریف لے جائیں مجھ کو میری قسمت پر چھوڑ دیں۔''

میں: ''اچھا میں نے چھوڑا تم کو اب بتاؤ تم کیا کرو گے؟''

اختر: ''میں اسی طرف کو جاتا ہوں جدھر ایکسپریس گئی ہے اور اس کے لئے جاتا ہوں جس کا پتہ ونشان بھی مجھ کو نہیں معلوم۔''

میں: ''اچھا تم مجھ کو آدھ گھنٹہ دو کہ میں اپنے حواس بجا کر کے شاید کوئی تکریب نکال سکوں۔''

اختر میری بات پر راضی ہو گئے اور میں نے یہ طے کرنے کے بعد کہ ان کی ضد پوری کر دی جائے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دوسری بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی پر تھوڑی دور تک ان کو سیر کرا دی جائے۔ لہٰذا میں نے ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھا اور اس سے اور بھی اطمینان ہوا

کہ گھنٹہ بھر بعد میل ٹرین چھوٹے گی جو ایکسپریس کو بنیا کے جنکشن پر پکڑ لیتی ہے لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ بنیا تک جانا چاہیے اور وہاں یہ حضرت اپنی محبوبہ کی زیارت بھی کر لیں گے میں نے ان کو واپس آ کر یہ مژدہ سنایا مگر وہ تو مجھ کو ہمیشہ کا جھوٹا نہ سہی تو کم از کم اس عشق کے آغاز سے تو جھوٹا ہی سمجھنے لگے تھے لہٰذا وہ اس خوش خبری کو بھی ایک غلط تسلی سمجھے لیکن جب میں نے ان کے علاوہ اپنی بھیڑ قسم کھائی تو ان کو ذرا اطمینان ہوا اور اب انہوں نے اپنا رخ بجائے جانے والی گاڑی کی طرف کے آنے والی گاڑی کی طرف پھیر دیا‘ یہ پہلی حرکت تھی جو صبح سے اب تک انہوں نے کی اس کے علاوہ باقی حالات بدستور تھے کبھی آہ سرد بھرتے تھے کبھی۔

تیرے ترنم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

گنگناتے تھے اور کبھی ایک چشم غضب اس ناکردہ گناہ پر بھی ڈال دیتے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہمارا کیا قصور ہے اگر ہم نے دل لیا ہوتا یا ہم نے دل لینے والی کو بھڑکا کر ان کا دل اڑوا دیا ہوتا یا ہمارا کسی طرح بھی اس معاملے میں دخل ہوتا تو ایک بات تھی لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم بے خطا ہیں وہ حضرت ہم کو اس طرح دیکھ رہے تھے‘ گویا سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے ہماری ہمدردی ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے چائے پیش کی لیکن اس کا جواب بجائے شکریہ کے ایک حقارت آمیز چیں جبیں سے دیا گیا بلکہ جب ہم نے مع ٹوسٹ کے چائے کی پیالی بڑھائی تو حضرت اس زور سے جھڑک کر بولے کہ چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی‘ مجبوراً ہم نے خود چائے پی لی اور چپ ہو کر بیٹھ رہے حالانکہ ان کو ہر طرح کا اطمینان تھا کہ اب چلیں گے اور وہ نظارہ بھی حاصل ہو جائے گا جس کے لئے وہ پھڑک رہے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کا یہ حال ہوتا جاتا تھا گویا کسی سخت قسم کا دورہ شروع ہو گیا الجھی ہوئی سانسیں لے کر گھبرائی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف اس طرح دیکھتے تھے‘ گویا کسی کو قتل کر کے بھاگنے کی فکر میں ہیں کم از کم ان کی وہ خوفناک صورت دیکھ کر میں تو سہم ہی جاتا تھا اب ان حضرت کو مجھ سے ایک نئی شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ میں ہی گاڑی کی آمد میں تاخیر کا باعث ہوں کئی مرتبہ ڈانٹ کر مجھ سے پوچھا۔

”گاڑی کب آئے گی“

جب میں نے کہا کہ ”اپنے وقت پر آئے گی“ تو مجھ کو اور بھی کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

”اب کیا آئے گی، وہ کیوں آنے لگی“

لیکن خدا کا شکر ہے کہ گاڑی نے آ کر میری جان بچا لی اور ان کے ساتھ میں بھی گھبرا کر اپنے سامنے والے ڈبہ میں چڑھ گیا جو اتفاق سے اسباب وغیرہ کا ڈبہ تھا آدمیوں ہی کا ڈبہ نہ تھا‘ ورنہ معلوم نہیں اسباب کے ڈبہ گھسنا پڑتا یا گارڈ کے ڈبہ میں اس لئے کہ ان کی

وحشت مجھ کو بھی بغیر دل کھوئے ہوئے نیم وحشی بنا چکی تھی۔

بمبئی میل کی رفتار سے میرے تخیلات کی رفتار اور میرے تخیلات کی رفتار سے تیز اختر کی وحشت کی رفتار تھی۔ ہم دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ ریل کی چھک چھک کے سروں پر اپنے تخیلات کے نغمے اتارتے ہوئے سفر طے کر رہے تھے کہ یکا یک مجھ کو ٹکٹ نہ خریدنے کا خیال پیدا ہوا اور یقین جانئے کہ تمام بدن کا خون جو اختر صاحب کی وحشت سے بچ رہا تھا اس بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے خشک ہو گیا لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا اگر اختر سے کہتے تو ڈر تھا کہ ہمارے دوسرے ہم سفر نہ سن لیں اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی ریلوے ملازم ہو جو ہم کو اگلے سٹیشن پر ٹکٹ کے دام مع جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ بم سازی کے شبہ میں پولیس کے سپرد کر دئے' دوسرے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اختر زنجیر نہ کھینچ لے کہ بیٹھے بٹھائے پچاس روپے جرمانہ ادا کرنے کے لئے ہم کو اپنے اور اختر کے کپڑے بیچنا پڑیں۔' لہٰذا ہم نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔ لیکن صورت تو ایسی ہو گئی گویا اپنے کسی شریک سفر کا لوٹا چرانے کے بعد پکڑے گئے ہوں اور خود اس پر شرمندگی ہم کو سر نہ اٹھانے دیتی ہو' ہم اس چکر میں تھے کہ اب کیا ہو گا کہ اختر نے چونک کر پوچھا

’’کیا بنیا آ گیا؟‘‘

میں: ’’ابھی کہاں سے آ گیا یہ تو للت پور ہے اب آئے گا بنیا‘‘

اختر: ’’خدا جانے کب آئے گا؟ کیا ہمیشہ اتنی ہی دیر میں بنیا آتا تھا یا آج گاڑی سست چل رہی ہے؟‘‘

میں: ’’تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو اب جلدی کیا ہے اس کے بعد بس بنیا ہی سمجھو۔‘‘

اختر: ’’آج گاڑی کو یقیناً مجھ سے ضد ہو گئی ہے ورنہ اتنی دیر نہ لگتی۔ میرا دم الجھ رہا ہے میں پریشان ہوں مجھ سے وقت نہیں کٹتا۔‘‘

یہ کہہ کر اختر ایک دم کھڑا ہو گیا اور میں بھی اس طرح ان کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا گویا ہم دونوں میں ایک ہی اسپرنگ لگا ہوا تھا میں نے اختر سے بیٹھ جانے کو کہا اور معلوم نہیں کیوں اختر نے میری ہدایت پر عمل کیا میں بھی بیٹھ گیا اور اختر کے دل کو ادھر ادھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اختر دہی بڑے کھاؤ گے؟‘‘

اختر: ’’نہیں‘‘

میں: ’’للت پور کے دہی بڑے اور پاپڑ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں‘‘

اختر ’’نہیں‘‘

میں: ’’نہیں کیا واقعی مشہور ہیں تم کھا کر تو دیکھو یاد کرو گے' مزا‘‘

اختر: ’’نہیں‘‘

میں: ’’اچھا پاپڑ کھالو۔‘‘

اختر: ’’نہیں۔‘‘

اب میں نے گفتگو کا رخ بدل کر کہا کہ ’’تمہارے والد للت پور میں رہ چکے ہیں اور تمہارا بچپن یہیں گزرا ہے جب تم چھوٹے سے تھے اور تم کو ضعف معدہ کی شکایت تھی تو یہاں کے ایک بوڑھے سے حکیم جن کا بھلا سا نام تھا یاد نہیں آتا تمہارے معالج تھے اور انہوں نے تم کو فاقہ دلوائے تم بہت کمزور ہو گئے تھے اور بدنیت بھی ہر وقت کھانے کے لئے روتے تھے ہم تو اس وقت بڑے سے تھے اور تم کو بہت چھیڑا کرتے تھے، ایک مرتبہ تمہاری ٹانگوں میں گھس کر جو ہم کھڑے ہوئے تو تم بڑی زور سے گرے اور تمہاری پیشانی پر زخم آ گیا اس دن تمہارے والد ہم پر بہت خفا ہوئے تھے اور تم سے کہا تھا کہ اس شریر کے ساتھ نہ کھیلا کرو مگر ہائے بچپن دوسرے ہی دن پھر اس طرح ہم دونوں گلے مل گئے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا تم کو معلوم ہوتا ہے کچھ یاد نہیں۔‘‘

اختر: نہیں‘‘

اب ہم نے دیکھا کہ اس شخص نے ’’نہیں‘‘ کہنے کی قسم کھائی تو اس سے ایسی گفتگو کی جائے کہ یہ ’’ہاں‘‘ بھی کہے تا کہ اس کے بعد کوئی اور امکان پیدا ہو، لہٰذا ہم نے ڈھونڈ کر ایسا جملہ کہا کہ ’’ہاں کے علاوہ کچھ نہ کہا جا سکے‘‘

اختر: ’’اونھ‘‘

اب تو ہم اور بھی پریشان ہوئے کہ یہ ’’اونھ‘‘ تو ’’نہیں‘‘ سے بھی زیادہ خطرناک جواب ہے اس لئے کہ بعد والا درجہ خاموشی ہے لہٰذا ہم کو ذرا فکر پیدا ہو گئی لیکن فوراً ہی ہم کو خیال آیا کہ ان سے اسی کے متعلق سوال کئے جائیں، جس میں یہ کھوئے ہوئے ہیں اور واقعی یہ سوالات ضروری بھی تھے لہٰذا ہم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا۔

’’تم بنیا میں اس کو پہچان لوگے۔‘‘

اختر: ’’اس کو میں یہیں سے پہچان رہا ہوں۔‘‘

میں: ’’یہاں سے تو خیر پہچان رہے ہو مگر وہاں کس طرح پہچانو گے۔ اس کی پہچان کیا ہے؟‘‘

اختر: ’’جس کی طرف مجھ کو جھانسی سے کشاں کشاں لایا جا رہا ہے وہ بنیا میں بھی مجھ کو اپنے قریب کھینچ لے گا۔‘‘

میں: ’’مگر مجھ کو تو پہچان بتاؤ کہ کیسی صورت تھی کیا وضع قطع تھی تا کہ میں بھی پہچان سکوں۔‘‘

اختر: ’’صورت میں نے دیکھی نہیں بس ایک بجلی سی چمک کر میری آنکھوں کو جھپکا گئی اور میں تاب نظارہ نہ لا سکا۔‘‘

میں: ’’ کچھ لباس وغیرہ کے متعلق بتا سکتے ہو‘‘

اختر: ’’ہاں شاید ریشمی پیازی رنگ کی ساڑھی تھی اور بالوں میں اسی رنگ کا ریشمی فیتہ تھا۔‘‘

میں: ’’بظاہر مسلمان معلوم ہوتی تھی یا کوئی اور۔‘‘

اختر: ’’کافرہ تھی کافرہ‘‘

میں: ’’یعنی مسلمان نہیں تھی' اچھا کچھ اور بتاؤ۔‘‘

اختر: ’’میں کیا بتاؤں ایک برق مجسم تھی ایک شعلہ لرزاں تھی ایک وحدت مطلق تھی' ایک کفر سراپا تھی۔‘‘

میں: ’’ان پہچانوں سے تو میرے فرشتے بھی کسی کی شناخت نہیں کر سکتے۔‘‘

ایسا پتہ…… بنیا جنکشن دور سے نظر آنے لگا اور میرے منہ سے نکل گیا کہ بنیا آ گیا۔

یہ سنتے ہی اختر اس بے تابی سے کھڑکی میں جھکے کہ مجھ کو ان کا بازو پکڑ لینا پڑا کہ کہیں گر نہ پڑیں یا چھلانگ نہ ماریں۔

بنیا کے سٹیشن پر اختر تو بیتابی کے ساتھ اتر گئے لیکن ہم کو اپنے پاس ٹکٹ کا نہ ہونا پھر یاد آ گیا اور ہم اپنے کو چھپائے ہوئے اترے چونکہ بہ یک بینی و دو گوش تھے لہٰذا یہ جھوٹ بالکل بولا جا سکتا تھا کہ ہم مسافر نہیں ہیں کسی کو سوار کرانا چاہتے ہیں صرف یہی ایک ہمارے بچنے کا امکان تھا۔ گاڑی سے اتر کر دوسری گاڑی کی تلاش میں چلے۔ آگے آگے اختر تھے اور پیچھے پیچھے ہم' اختر تو آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ایک طرف کو چلے جا رہے تھے اور ہمارا یہ حال تھا کہ جو عورت نظر آتی تھی ہم بڑھ کر اختر سے پوچھ لیتے تھے کہ ’’دیکھو یہ نہیں ہے لیکن اختر ہمارے اس سوال کا جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھتے تھے اور بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اس بے تکے پن کو ناجائز سمجھ کر ایک قلی سے پوچھ لیا کہ ایکسپریس کہاں ہے اور صحیح پتہ معلوم کرنے کے بعد اختر کو لے کر دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچے جہاں ایکسپریس موجود تھی۔

اختر نے بیتابی کے مارے دو تین سیڑھیاں اترنا بھی مناسب نہ سمجھا اور مجھ کو پکڑ کر اس طرح پھاندے کہ اگر ذرا میں نہ سنبھلتا تو خود مع اختر کے ایک پان والے پر اس طرح گرتا کہ منہ ٹوٹ جاتا ورنہ پان والا تو ڑ دیتا چلتے چلتے اختر ٹھہر گیا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر کہنے لگا۔

’’وہ ہے میرا مرکز نظر وہ ہے‘‘

میں بھی اس کی انگلی کی سیدھ میں بندوق کے نشانہ کی طرح شست باندھ کر دیکھا تو ایک پیازی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی نازنین کی پشت دکھائی دی جس پر لمبے لمبے ریشمی بال ایک پیازی رنگ کے فیتے سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے بل کھا رہے تھے اور ساڑھی میں ہوا نے ایک تموجی کیفیت پیدا کر دی تھی وہ نازنین ایک سیکنڈ کلاس میں بیٹھی تھی اور بظاہر یا تو پارسن تھی یا عیسائن میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا' اختر کا تو وہی حال ہو گیا جو جھانسی کے سٹیشن پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو نصب کر دیا گیا ہے کمال تو یہ ہے کہ اس شخص کی آنکھیں بھی پتھر کی معلوم ہوتی تھیں' کیا مجال جو ایک مرتبہ بھی جھپکی ہوں' جب اسی عالم میں کافی دیر ہو گئی تو میں نے کہا۔

''اب جا کر قریب سے دیکھ لو نہیں تو ریل چھوٹ جائے گی۔''

اختر: ''ہوں''

میں: ''ہوں کیا' دیکھنا ہے تو دیکھ بھی لو صورت ہی نہ دیکھی تو کیا دیکھا''

اختر: ''مگر میں دیکھ نہ سکوں گا' بغیر دیکھے میرا یہ حال ہے شاید دیکھ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔''

میں: ''نہیں دیکھ لو' چلو میں بھی چلتا ہوں' ادھر سے دیکھیں گے۔''

اختر خود تو نہیں چلے' چلائے گئے' میں نے ان کا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور وہ ڈگمگائی ہوئی چال سے آگے بڑھے' ہم دونوں چکر کاٹ کر اس طرح پر پہنچے جدھر اختر کی مطلوبہ کا رخ روشن تھا لیکن ادھر سے جا کر دیکھا تو ادھر بھی پشت ہی تھی غالباً اس عرصے میں اس نے اپنا رخ بدل دیا یا اس کے دونوں رخ یکساں تھے بہر حال ہم دونوں پھر اپنی پہلی جگہ پر واپس آئے اس مرتبہ اس کا رخ ہماری طرف تھا لیکن میں نے غیر ارادی طور پر گردن جھکا لی غالباً اس لئے کہ پرائی چیز تھی اور اختر نے اس لئے آنکھیں چار نہ کیں کہ کلوروفام کے اثرات کا اندیشہ تھا لیکن میری گردن ایک دم سے اختر کے ''ارے'' کہنے سے اوپر اٹھی اب جو دیکھتا ہوں تو ایک پچپن سالہ بڑی بی' چیچک کے نقشین چہرے کو ہماری طرف اٹھائے نہایت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور غالباً اختر کی روح قفس عنصری سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی ہو گی دیر تک ہم دونوں منہ کھولے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے آپس میں ایک دوسرے کی نقل اتار رہے ہیں اور جب ہوش بجا ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اس طرح پیٹھ موڑ لی گویا۔

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

کی مشق کر رہے ہیں میں نے احتیاطاً پھر ان بزرگ کے قریب جا کر ان کو اس لئے دیکھا کہ کہیں یہ کوئی اور نہ ہوں لیکن دراصل یہ وہی

برق مجسم، وہی شعلہ لرزاں وہی وحدت مطلق اور وہی کفر سراپا تھیں، جن کے لئے ہم یہاں آئے تھے اختر کا یہ حال تھا کہ ایک چپ لگ گئی تھی، میرے سامنے منہ بھی نہ کرتا تھا اور مجھ کو اختر کے "ہولو پن" پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ اگر اپنی اولاد ہوتی تو عاق کئے بغیر نہ چھوڑتا مگر "دیوانہ تو دیوانہ" کرتے تو کیا کرتے آخر میں نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا کہ "دل دینے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ کس کو دیا جا رہا ہے اور عشق کرنے کے لئے تعین عمر لازمی ہے۔"

اختر نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر پیٹھ موڑ لی اور میں واپسی کے لئے ٹرین کا وقت دیکھنے ٹائم ٹیبل کی تلاش میں بک سٹال کی طرف چل دیا معلوم نہیں کہ ایکسپریس کب چھوٹی۔

◆◆◆

ایڈیٹر

اس سے قبل کہ میں اس جنس کے متعلق کچھ عرض کروں ضرورت اس کی ہے کہ میں خود اپنی پوزیشن بھی واضح کر دوں کہ خود میں بھی ایڈیٹر رہا ہوں، ایڈیٹر ہوں اور چونکہ ایڈیٹری کرنے کے بعد ایک آدمی دوسرے مشاغل کے لئے بیکار ہو جاتا ہے اور دنیا میں رہ کر سوائے ایڈیٹری کرنے اور کچھ نہیں کر سکتا لہٰذا بظاہر تو یہی امید ہے کہ آئندہ بھی ایڈیٹر ہی رہنا پڑے گا ایسی صورت میں دوسرے ایڈیٹر صاحبان کو اس مضمون پر ناک بھول چڑھانے کی زحمت نہ اٹھانا چاہیے بلکہ یہی سمجھنا چاہیے کہ ایک گھر کا بھیدی لنکا ڈھا رہا ہے۔

بہ حیثیت ایک ایڈیٹر کے یہ خاکسار ایڈیٹران ملک وملت کے متعلق جس رائے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ ایڈیٹر دراصل اس حیوان ناطق کو کہتے ہیں جس پہ آسانی کے ساتھ حیوان مطلق کا شبہ ہو سکے بلکہ بعض اوقات تو یہ حیوان ناطق معلوم ہوتا ہے نہ حیوان مطلق، البتہ اس کو ایک ایسی مشین سمجھا جا سکتا ہے جو میز سے ٹکا کر کرسی پر رکھ دی گئی ہو اور جس میں کچھ اس قسم کی کوک بھر دی گئی ہو کہ بس لکھتا رہے اور جس طرح ایک مشین کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کے کس حصہ پر گرد پڑی ہے اور وہ کتنا کام کر چکی ہے اس طرح یہ مشین بھی اس سے قطعاً خالی الذہن رہتی ہے کہ اس کی کیا گت بنی ہوئی ہے کپڑے میلے ہیں یا اجلے خط بڑھا ہوا ہے یا نہیں، جلد پر کس حد تک میل جم چکا ہے اور صورت سے انسانیت کس قدر غیر متعلق ہو چکی ہے بس اس کو تو اسی سے کام ہے کہ لکھے اور لکھے جائے اور اس وقت تک لکھنے سے باز نہ آئے جب تک کہ اخبار لکھنے والے کاتب چیخ نہ اٹھیں کہ للہ اب قلم کو روکو، آپ کو اگر یقین نہ آتا ہو تو کسی ذمہ دار اخبار کے دفتر میں جا کر دن کو یا رات کو یہ تماشہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایڈیٹر صاحبان آپ کو کرسی پر لٹکے ہوئے ملیں گے اور اگر وہ واقعی ایڈیٹر ہیں تو ان کی صورت سے آپ کو یہی اندازہ ہوگا کہ کوئی حبس دوام کا قیدی بیٹھا ہوا چکی پیس رہا ہے۔

اس خاکسار کو سب سے پہلے جن ایڈیٹر صاحب سے واسطہ پڑا وہ استاذی سید جالب دہلوی مرحوم ومغفور تھے جو روزنامہ ''ہمدم'' لکھنو کے چیف ایڈیٹر تھے اور یہ خاکسار بہ حیثیت ایک رکن ادارہ کے صحافت کے اس باوا آدم کے پاس اخبار نویسی کا باقاعدہ بغدادی پڑھنے کو بٹھایا گیا تھا سید جالب مرحوم کو اردو صحافت میں جو درجہ حاصل تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ذرا اس بزرگ محترم کی وضع قطع بھی ملاحظہ فرما لیجئے کہ کیا تھی آپ کے سر پر انگریزی بال تھے جو کبھی محتاج شانہ نہیں ہوئے اور ہمیشہ بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے رہتے تھے ان بکھرے ہوئے بالوں پر ترکی ٹوپی بھی اس طرح زیب سر کی جاتی تھی کہ بال ہر طرف سے نکلے ہوئے

ہیں اور ٹوپی بھی متعدد جگہ سے پچکی ہوئی ہے سر پر رکھی ہوئی ہے پھندنا آگے لٹک رہا ہے او پھندنے کے آگے سفید بالوں کا ایک آدھ گچھا موجود ہے۔ شیروانی کا یہ حال کہ اول تو نصف کے قریب بٹن لگائے ہی نہ جاتے تھے اور جو لگائے جاتے تھے وہ اس طرح کہ نیچے کا بٹن اوپر کے کاج میں لگا دیا تو اوپر کا بٹن مجبوراً نیچے کے کاج میں لگانا پڑتا تھا اور عموماً نیچے کے بٹن اس طرح کھلے رہتے تھے کہ شیروانی ہمیشہ پر پھیلائے رہتی پاجامہ کا کونسا پائنچہ اونچا ہے اور کونسا نیچا اس کی کبھی آپ کو خبر نہ ہوتی تھی البتہ ازار بند کو اکثر لٹکنے سے روکا جاتا تھا حد تو یہ ہے کہ جب سید جالب صاحب ہمدم سے مستعفی ہوئے اور ان کی رخصتی پارٹی کے موقع پر گروپ لینے کا انتظام کیا گیا تو آپ نے لباس کی طرف غیر معمولی توجہ فرما کر ذرا ٹوپی بھی ٹھیک سے پہن لی تھی اور شیروانی کے بٹن بھی آج پہلی مرتبہ باقاعدہ لگے ہوئے تھے لیکن جوتے کی ڈوریاں آج بھی کھلی ہوئی تھیں، قاضی حامد صاحب سب ایڈیٹر نے فرمایا کہ ''میر صاحب جوتے کی ڈوریاں کھلی ہوئی ہیں'' اس خاکسار نے کہا ''حاجت مشاطہ نیست'' اور جالب صاحب کے خلف رشید نے بغیر سوچے سمجھے اس مصرع کو مکمل کر دیا کہ ''روئے دل آرام را'' خیر یہ تو باپ بیٹا کا باہمی مذاق تھا۔ ہم سے کیا مطلب؟ مگر مطلب کہنے کا یہ ہے کہ سید جالب صاحب چونکہ صحیح معنوں میں ایڈیٹر تھے لہٰذا یہ بھی ان کی ہیت جو ہم نے عرض کی۔

اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ تمام ایڈیٹر ایسے ہی ہوتے ہیں یا جو کوئی بھی ایڈیٹری کرنے چلے اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے جی نہیں بلکہ ہم نے اگر ایک طرف اس قسم کے ''ہمہ تن ایڈیٹر'' دیکھے ہیں تو ایسے ایڈیٹر صاحبان بھی ہماری نظروں سے گزرے ہیں جو بوٹ سوٹ سے لیس ہوں اور جن کے قریب سے گزر جانے والا انسان ایک ہفتہ تک لونڈر سے مہکتا رہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے ضرور قاصر ہیں کہ یہ حضرات ایڈیٹری کے فرائض کی تکمیل کے ساتھ اپنے بناؤ سنگار کی تکمیل کے لئے کہاں سے وقت نکالتے ہیں اس لئے کہ وہ ایڈیٹر جو واقعی ایڈیٹر ہیں اور کسی واقعی اخبار کے ایڈیٹر ہیں ان کو تو دراصل اتنی بھی مہلت نہیں ملتی کہ وہ کسی وقت اپنے انسان ہونے کے متعلق غور کر سکیں گے ان کو تو شب و روز اسی کی فکر رہی ہے کہ دن کو ڈاک کے وقت کے اندر کسی نہ کسی طرح مر کھپ کر ڈاک ایڈیشن تیار کرا دیں اور رات کو شب فرقت کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ کر لوکل ایڈیشن ترتیب دیں اس کے بعد جب ایک آدھ گھنٹے کے لئے سونے کا موقع ملے تو یہ خواب دیکھیں کہ کاپی جڑ وا رہے ہیں اور کھانے پینے کی فرصت کے وقت یہ سوچیں کہ آج ہم کو اپنے ادارتی مقالہ میں بہار ریلیف فنڈ کی قلعی کھولنا ہے اور اپنے مزاحیہ کالم میں مسٹر چرچل کی خیریت مزاج دریافت کرنا ہے خواہ اس غور و فکر کے انہماک میں نوالہ منہ میں جائے یا ناک میں، ایسی حالت میں آپ خود ہی بتائے کہ کسی ایڈیٹر کو سولہ سنگار کرنے اور بن ٹھن کر کرسی ادارت پر اپنے حسن جہاں سوز کی نمائش کرنے کا موقع کس طرح مل سکتا ہے؟

واضح رہے کہ ہمارا مقصد صرف ان روزانہ اخبارات سے ہے جو با قاعدہ قسم کے روزانہ اخبارات ہیں اور جنکے دفاتر میں نہ صرف دن کو چہل پہل رہتی ہے بلکہ رات کو بھی ''رتجگا'' ہوتا ہواور جن کے ارباب حل وعقد کو شب وروز اسی قسم کے تاروں کا انتظار رہتا ہو کہ کہاں گولی چلی' کس جگہ آسمان ٹوٹ پڑا کون سا مشہور آدمی مرا' کہاں ریل لڑی اور دنیا کے کس حصہ میں قیامت آ گئی۔

اس قسم کے خالص ایڈیٹروں کے علاوہ آپ کے ہندوستان میں سینکڑوں قسم کے اور ایڈیٹر بھی پائے جاتے ہیں اور ان ایڈیٹروں کے لئے یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ بھی انسانیت سے اسی طرح بیزار ہوں جس طرح سچ مچ کے ایڈیٹر ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ہر حیثیت سے مکمل انسان بلکہ اکثر غلمان ہوا کرتے ہیں اور بعض جینے کے لئے اپنے نام کے آگے ایڈیٹر بڑھا لیتے ہیں اس قسم کے ایڈیٹروں کی تعداد آپ کو ہندوستان کی مردم شماری سے ملتی جلتی ملے گی اور اگر آپ اس سلسلہ میں تحقیقات کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے حضرات تو محض اس لئے ایڈیٹر بن گئے کہ انہوں نے انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو کر ڈپٹی کلکٹری سے لیکر ریلوے کی ٹکٹ چیکری تک کے لیے اور میونسپل بورڈ کی کلرکی سے لے کر پولیس کی کانسٹیبلی تک کے لئے جب تمام کوششیں کرلیں اور ہر کوشش میں جھک مار چکے تو مجبوراً صرف اسی طرف متوجہ ہونا پڑا کہ یا تو بساطی کی دکان کھول لیں ورنہ کوئی اخبار نکال دیں اور چونکہ اخبار کا ایڈیٹر بننا بساطی بننے سے اعزاز کی بات تھی لہٰذا وہ ایڈیٹر بن گئے اور ایک ایسا ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا ہے جو کسی سہ ماہی رسالہ کا لطف دے' کسی ایڈیٹر سے اس کی ایڈیٹری کا سبب پوچھئے تو وہ صاف صاف یہی بتا دے گا کہ ایڈیٹروں کے پاس دعوتوں کے کارڈ بہت آتے ہیں کوئی ایڈیٹر صاحب محض اس لئے ایڈیٹر بن گئے ہیں ان کو اپنی سمن حاصل کرنے کی قابلیت پر پورا پورا اعتماد تھا لہٰذا انہوں نے ایک ''سمن'' بغرض انتقال مقدمہ قسم کا اخبار جاری کر دیا ہے' اور اپنے سمنی اغراض ومقاصد کے لئے ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں بہت سے ایسے ایڈیٹر ہیں کہ ان کے اخبار گھر بار کا مقصد صرف یہ ہے کہ تھیٹر اور سینما کے اشتہارات مفت شائع کیا کریں اور صرف پاس حاصل کرنے کے لئے ایڈیٹری کو اپنا پیشہ بنائیں ہم نے اپنے ایک دیرینہ کرم فرما سے جو کسی ٹیلرنگ شاپ کے مالک تھے۔ ان کو ایک ماہوار رسالہ کا ایڈیٹر دیکھ کر پوچھا کہ ارے تم ایڈیٹر ہو گئے۔ اس بے چارے نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''بھائی اور کیا کرتے؟ اس کا مقصد یہ ہوا کہ وہ لوگ ایڈیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو دنیا میں کچھ اور کر ہی نہیں سکتے' حالانکہ ایک آدھ پرچہ نکالنے کے بعد جب ان کو باحسرت ویاس اس ایڈیٹری کی دکان کو بھی بند کرنا پڑتا ہے' اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر بننا ٹیلر ماسٹر بننے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے' بہرحال آپ کے ہندوستان میں صحافت بہ حیثیت فن کے نہ سہی مگر بہ حیثیت پیشہ کے ماشاءاللہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور بھانت بھانت کے ایڈیٹر ڈھل رہے ہیں۔

"لندن آفس" قسم کے ان اعزازی ایڈیٹروں کو چھوڑ دیجئے جو ملاح در چین و گشتی در فرنگ کے مصداق دنیاے ایک گوشہ میں خود ہوتے ہیں اور دوسرے گوشہ میں شائع ہونے والے رسالہ کے سرورق پر ان کا نام نامی اسم گرامی نظر آتا ہے اس لئے کہ اگر اس قسم کے ایڈیٹروں کو بھی آپ نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا تو اس فہرست کے اعداد و شمار مردم شماری کے اعداد و شمار سے بھی بڑھ جائیں گے۔ آپ ان ایڈیٹروں سے قطع نظر فرما کر صرف ان ہی ایڈیٹروں کو دیکھئے جو اپنی کرسی ادارت پر ذمہ داری کے ساتھ رونق افروز ہیں، ان ایڈیٹروں میں خدا جانے آپ کو کس کس قسم کے ایڈیٹر ملیں گے، بہر حال ہم کو تو ایسے بھی ایڈیٹر ملے ہیں جن سے ملنے کے لئے ہم بڑی عقیدت سے گئے اور ان کے دفتر میں پہنچ کر مصلح سنگ سے دریافت کیا کہ ایڈیٹر صاحب کہاں ہیں تو مصلح سنگ صاحب نے لنگی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے فرمایا کہ "فرمایئے یہی خاکسار ہے" آپ ہی بتایئے کہ ہم کو مصلح سنگ کے اس جواب پر کیوں کر یقین آ سکتا تھا، لیکن لیکن جب متعدد مرتبہ سوال کرنے کے بعد ہم کو یہ یقین دلایا جائے کہ یہی شخص ایڈیٹر ہے جو بظاہر مصلح سنگ نظر آ رہا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر ہمارا دل خودکشی کرنے کو چاہے گا یا نہیں۔ مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو اس ہندوستان میں ان مصلح سنگ صاحب سے بھی زیادہ شاندار قسم کے ایڈیٹروں کی توقع ہے، لہٰذا ہم کو حیران ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی یہ بیچارہ تو صرف اسی قدر کرتا تھا کہ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے زریں اصول پر چل کر خود ہی لکھتا تھا اس کے بعد خود ہی خوشنویس کے فرائض انجام دیتا تھا، خود ہی اصلاح سنگی کی خدمت انجام دیتا تھا اور آخر میں خود ہی اپنا ہینڈ پریس چلا کر وہ اخبار تیار کر لیتا تھا جو اس کو بجائے خوش نویس یا مصلح سنگ کے دنیا کی نظروں میں ایڈیٹر بنائے ہوئے ہے۔

وہ گئے اس قسم کے ایڈیٹر جن کی وجہ سے قانون مطابع روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے اور جن کے لئے جیل کا دروازہ ہمیشہ کشادہ رہتا ہے وہ ذرا کم پائے جاتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر ایڈیٹری کر کے جیل ہی جانا ہے تو ایڈیٹری کے بجائے چوری کیوں نہ کرے۔ جس سے کم سے کم جیل جانے کا معاوضہ تو مل جاتا ہے یہ کیا کہ ملک و قوم کا تمام درد سمیٹ کر اپنے دل میں رکھ لیا اور اس درد کا اظہار اپنے اخبار میں اس طرح کیا کہ

دھرے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

ایڈیٹری اس لئے کرنا کہ جیل میں چکی چلانا پڑے یا ضمانت میں باپ دادا کی کمائی سے لے کر بیوی کا جہیز تک نیلام چڑھ جائے۔ ہمارے خیال میں ایڈیٹری کرنا تو نہیں شامت بلانا ہے، اور یقیناً اس حیثیت سے وہ لوگ مزے میں ہیں جو اس طرح اپنی جان کھپانے کے بجائے "ایڈیٹر کا نامہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں" کے اصول پر چل کر بس اس قسم کے مضامین سے اپنا اخبار بھر

دیتے ہیں کہ کمن بند نہ ہوں اور اتنے کمن ہر اشاعت کے لئے مل جایا کریں کہ بال بچے بھوکے نہ رہیں، یہ نہیں کہ اخبار کی رجہ سے اپنی زندگی مستقل عذاب بنالی جائے یقین نہ آتا ہو تو دھرمپال صاحب گپتا وفا سے پوچھ لیجئے کہ وہ کتنے دنوں سے پوری نیند سونے کے لئے ترس رہے ہیں۔

◆◆◆

السلام علیکم

یاد ایامیکہ السلام علیکم، مسلمانوں کا شرعی سلام تھا لیکن اب تو اس کا وجود صرف تین جگہ ہے۔ علی گڑھ کالج میں، مسجدوں میں اور جولاہوں کے یہاں خدا جانے دنیائے اسلام کے مرکز عرب میں السلام علیکم کا کیا حال ہے لیکن اگر ہندوستان علی گڑھ کالج کو چھوڑ کر مسجدوں کے علاوہ اور جولاہوں کو نظر انداز کر دینے کے بعد آپ السلام علیکم کو کہیں تلاش کریں تو آپ کی جستجو ناکام رہے گی۔ خدا بھلا کرے سرسید علیہ الرحمۃ کا کہ انہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد السلام علیکم پر رکھی تھی اور آج اگر کہیں اس اسلامی سلام کا دور دورہ ہے تو علی گڑھ کالج میں یہ اور بات ہے کہ علی گڑھ کالج میں کثرت استعمال سے السلام علیکم بگڑتے بگڑتے ”سامالیکم“ ہو گیا۔ لیکن اگر آپ اس کے جواب میں ”وعلیکم السلام“ کو ڈھونڈھنا چاہیں تو علی گڑھ کالج میں بھی اس کا پتہ نہ چلے گا، وہاں تو بس ”سامالیکم“ ہے کہ سلام بھی اسی سے کیا جاتا ہے اور جواب بھی اسی سے دیا دیا جاتا ہے۔ آپ کالج کے کسی گوشے میں چلے جایئے آپ کے نزدیک سے آپ کے سامنے سے آپ کے پیچھے سے آپ کی بغل سے جتنے طلباء، ماسٹر، پروفیسر چپڑاسی، دھوبی نائی، باورچی، پوسٹ مین جو کوئی بھی گزرے گا اس زور سے منہ کھولے بغیر ”سامالیکم“ جھاڑے گا کہ اگر آپ اجنبی ہیں تو گالی سمجھیں گے اور آپ کا دل چاہے گا کہ خود ”سامالیکم“ کہہ دیں لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس سامالیکم کی ایسی دھواں دھار بارش ہوگی کہ آپ اس ژالہ باری کے عادی ہو جائیں گے اور لطف یہ ہے کہ اگر آپ ”سامالیکم“ کا تماشا دیکھنا چاہیں تو آپ کو بڑا مزہ آئے گا جب آپ دیکھیں گے کہ ہر شخص ایک دوسرے سے ”سامالیکم“ کہتا ہے اور جس زور سے کہنے والا سامالیکم کہتا ہے بالکل اسی آواز میں جواب دینے والا سامالیکم کہتا ہے گویا اپنے اوپر آئی ہوئی بلا فوراً واپس کر دی یا فٹ بال کو اسی طرف ٹھوکر مار کر روانہ کر دیا جدھر سے وہ لڑھک کر آیا تھا، یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے کان اس ہنگامہ ”سامالیکم“ کے ایسے عادی ہو جائیں گے جیسے خاموش فضاؤں میں جھینگر کی آواز کے عادی ہو جاتے ہیں، خیر وہ ”سامالیکم“ سہی لیکن شکر ہے کہ علی گڑھ کالج کے ”گڈ مارننگ دانوں“ میں اس کا رواج ہے، یہ سچ ہے کہ وعلیکم السلام وہاں سے بھی ختم ہو چکا لیکن یہی کیا کم ہے کہ ”سامالیکم“ ابھی تک وہاں موجود ہے خدا اس کو باقی رکھے۔

مسجدوں کے ذکر کو چھوڑیئے اس لئے کہ وہاں ”السلام علیکم“ کیا بہت سی باتیں بفضلہٖ موجود ہیں یہاں تک کہ ”وعلیکم السلام“ وہاں سے غائب نہیں ہوا ہے بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اگر مسجدیں خدانخواستہ نہ ہوتیں اور پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے سلسلے میں گنتی کے

چند مسلمان وہاں نہ جاتے ہوتے تو یہ السلام علیکم آج کسی کو یاد بھی نہ ہوتا۔ دن بھر میں کم سے کم پانچ مرتبہ رٹنے کے بعد تو یہ حال ہے کہ مسلمان بجائے یاد رکھنے کے السلام علیکم کو بھولے جارہے ہیں اور اس کی جگہ آداب' تسلیمات وغیرہ سب کو یاد ہیں لیکن تعجب ہے کہ جولاہوں میں ''السلام علیکم'' علی گڑھ کالج کے ''سلامالیکم'' میں ایک ''لام'' کے اضافہ کے بعد اب تک رائج ہے اور وہ بیچارے ابھی تک ''سلامالیکم'' کہتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صرف نوربافوں ہی کی قوم ایسی رہ گئی ہے جو اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور جن کو یہ وہم ہوگیا ہے کہ شاید مذہب اسلام نام ہے جولاہے پن کا کہ وہ جتنی حرکتیں کرتے ہیں سب کو شرع السلام کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ بیچارے نیک دل ہوتے ہیں سیدھے سادھے ہوتے ہیں' اور سمجھتے ہیں کہ صرف جولاہوں کے دم سے السلام کا چراغ روشن ہے خیر ان کے سمجھنے سے یہ تو ہوتا ہے کہ ''مسجد میں جمن مل جاتے ہیں ورنہ کوئی بھی نہ ہوتا۔ اس طرح کہ جس طرح جلاڈ ہے اسلام کو اپنا اور صرف اپنا سمجھتے ہیں مسلمان صرف اپنے کو سمجھتے ہیں نماز صرف اپنی سمجھتے ہیں اسی طرح غیر جولاہے بھی تو نماز روزے کو جولاہے پن سمجھنے لگے ہیں اور ہمارے نزدیک تو یہی راز ہے ''السلام علیکم'' کے متروک ہونے کا کہ لوگوں نے اس کو جولاہوں کا سلام سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اور جولاہے اپنے ''سلامالیکم'' کو عادتاً اختیار کئے ہوئے ہیں وہ تو کہئے کہ جولاہوں میں یہ بات اچھی ہوتی ہے کہ جو عادت پڑ جاتی ہے مشکل سے چھوٹتی ہے ورنہ السلام علیکم صرف مسجدوں اور علی گڑھ کالج میں رہ جاتا علی گڑھ کالج میں ڈھیلا مارنے کی طرح اور مسجد میں بم کی آواز بن کر لیکن شکر ہے کہ جولاہے حقہ کی طرح ''سلامالیکم'' کے بھی عادی ہیں۔

◆◆◆

بس جھانسی تک

لکھنو سے کانپور اتنا ہی دور ہے جتنا کانپور سے لکھنو اور جھانسی ایکسپریس ان کا درمیانی راستہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں طے کر لیتی ہے لیکن آپ کے ملا رموزی صاحب کو خدا نے کبھی یہ توفیق نہ دی کہ جب وہ بھوپال سے ذرا کانپور تک آئیں تو لکھنو بھی ہو لیں' بھوپال سے چل کر کانپور تک آنے والا اور بغیر لکھنو آئے لوٹ جانے والا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے بمبئی سے لوٹ آنے والے حاجی ہوتے ہیں۔ ہم کو ملا رموزی کی یہ حرکت بالکل ملاؤں کی ایسی معلوم ہوئی اور ہم نے ذرا غضبناک ہو کر فیصلہ کر لیا کہ اگر بمبئی بھی جانا ہو گا تو چاہے ہم کو سمندر ہی کے راستے کیوں نہ جانا پڑے مگر بھوپال کی طرف سے تو نہ جائیں گے چنانچہ یہی ہوا کہ جھانسی جانے کا اتفاق ہوا مگر ہم نے بھوپال کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا حالانکہ ادھر بھی یہی حال ہے کہ جتنا بھوپال جھانسی سے دور ہے اتنا ہی جھانسی بھوپال سے فاصلہ پر ہے البتہ راستہ چھ سات گھنٹے کا ہے اگر ہم چاہتے تو ادھر بھی ہو لیتے مگر ہم کو انتقام لینا تھا لہٰذا گئے جھانسی تک اور واپس آ گئے۔

ہم تو جھانسی بھی نہ جاتے مگر یہ آپ کے حامد شاہجہان پوری صاحب جو ہیں انہوں نے ہندوستان کے تمام پر فضا مقامات میں جھانسی کو منتخب کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی ہے۔ سکونت تک تو پھر بھی خیر کوئی مضائقہ نہ تھا' جی نہیں ملازمت بھی اختیار کر لی ہے لہٰذا وہ حضرت وہاں اس طرح رہتے سہتے ہیں گویا رانی جھانسی کے خاص عزیزوں میں ہیں اور محض مذاق میں اپنے کو شاہجہان پوری لکھتے ہیں ان حضرت کو ہم اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں' حالانکہ ہم دونوں کا بچپن بھوپال میں جہاں اب ملا رموزی صاحب کا دولت خانہ ہے اس طرح گزرا ہے کہ ہم دونوں آپس میں نہایت محبت سے کھیلتے تھے اور کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے کا منہ نوچ لیا کرتے تھے اور پھر دونوں مل کر ایک گاؤ تکیہ کو چچا میاں کی شیروانی پہنا کر پگڑی باندھ کر بالکل چچا میاں بنا کر بٹھا دیتے تھے' تاکہ باہر سے آنے والے اس گاؤ تکیہ کو نہایت ادب سے سلام کریں لیکن اکثر خود اصلی چچا میاں کو بھی اپنے مجسمہ کی سلامی اتارنا پڑتی تھی اس وقت تو خیر بڑائی چھوٹائی کا خیال نہ تھا لیکن اب چونکہ ہم ان سے دو سال عمر میں "برادر عزیز" ہیں لہٰذا وہ ہم کو شوکت بھائی کہتے ہیں اور چونکہ وہ ہم سے دو تین سال عمر میں "برادر محترم" ہیں لہٰذا ہم ان کو حامد بھائی کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم غلطی پر ہیں اور وہ حضرات بھی کر سکتے ہیں جن کو خدا نے بھائی صاحب قبلہ بنایا ہے ظاہر ہے کہ ہم کو حامد بھائی کہنا ہی چاہیے تھا لیکن ان کا شوکت بھائی کہنا ذرا غور طلب ہے

از روئے قاعدہ تو ہم شوکت کہلانے سے زیادہ کے مستحق نہیں ہیں لیکن اگر وہ بھائی بھی کہتے ہیں تو اس میں ہمارا کیا نقصان' ان ہی کو لوگ کہیں گے کہ ''بڑا شریف آدمی ہے'' ہاں تو وہ ہمارے حامد بھائی مع بھابی صاحبہ کے جن کو ہم نے اس سفر کی تقریب میں ''انیس حامد'' کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا ہے اسی جھانسی میں رہتے ہیں جنکا ذکر ہم کر رہے ہیں اتفاق سے انیس حامد بھی شاہجہانپوری ہیں لیکن وہ بیچاری چونکہ شاعرہ نہیں ہیں' لہٰذا ان کو اس وقت تک ہندوستان میں سوائے حامد بھائی کے اور کوئی نہیں جانتا تھا حامد بھائی کا شاہجہانپوری ہونا اور نہ ہونا سب یکساں ہے لیکن انیس حامد کی وطن پرستی ان کو بھی کبھی ادھر کھینچ لاتی ہے اور شاہجہانپور جانے والے حامد بھائی لکھنو کے سٹیشن پر ہم سے بھی مل لیا کرتے ہیں۔

اگر ہماری سسرال بھی دنیا' گوالیار وغیرہ میں ہوتی تو ہم بھی اسی طرح جھانسی سے گزرا کرتے لیکن ہم کوئی فرہاد کے خاندان سے تو ہیں نہیں کہ پہاڑی ممالک میں سسرال بناتے لہٰذا ہم تو اس سے محروم ہی رہ گئے لیکن حامد بھائی کا قیام جھانسی اور لکھنو سے گزرنا ہمارے سفر جھانسی کی بنیاد بن گیا ایک مرتبہ فرمانے لگے ''جھانسی آؤ'' ہم نے بھی گردن ہلا دی بس انہوں نے اس گردن ہلانے سے اتنا فائدہ اٹھایا کہ جھانسی میں مشاعرہ منعقد کر دیا اور ہمارے نام وارنٹ مشاعرہ المتخلص بہ کارڈ مشاعرہ بھی دیا اور لکھ دیا کہ یہ مشاعرہ تمہارے لئے ہے اگر نہ آئے تو اچھا نہ ہوگا ہم نے کارڈ اٹھا کر ایسی جگہ رکھ دیا کہ اگر پھر خود بھی تلاش کرنا چاہتے تو نہ ملتا لیکن جب ہر دوسرے تیسرے دن ایک کارڈ آنا شروع ہو گیا تو ہم نے غور کیا کہ کہیں قیامت کی طرح ہمارا جھانسی جانا بھی برحق تو نہیں ہے اور بعد میں یہ نتیجہ نکلا کہ قیامت برحق ہو یا نہ ہو لیکن جھانسی جانا ضرور برحق ہے' لہٰذا ہم نے لکھ دیا کہ آئیں گے' حالانکہ دفتر سے نہ تو رخصت مل سکتی تھی نہ ہم رخصت لینا چاہتے تھے لیکن بعد میں رخصت ملی بھی اور ہم نے رخصت لی بھی اور جھانسی روانہ ہونے کے لئے گھر سے چل کھڑے ہوئے۔

ہمارے ہم سفر ہم کو ملا کر چار تھے یعنی ایک ہم خود ایک ہمارے دوست اور حامد بھائی کے شاگرد رشید عبدالمجید صاحب کمال ایک لکھنو کے مشہور رسالہ ''خضر راہ'' کے ایڈیٹر جناب حامد ندوی اور ایک حامد ندوی صاحب کے بھائی یعنی خالہ زاد برادر عزیز جن کا اسم مبارک ہم کو راستہ بھر بتایا گیا مگر ہم یاد نہ رکھ سکے ہم چاروں ایک جگہ جمع ہو کر جتھے کی شکل میں چلے اور چونکہ چار تھے لہٰذا ریلوے سٹیشن بھی چار باغ قسمت سے ملا جہاں سے جھانسی ایکسپریس ہر روز رات کو گیارہ بجے چھوٹا کرتی تھی اور چونکہ وہ یہیں سے چھوٹتی ہے لہٰذا مسافر جب چاہتے ہیں اپنا بوریا بندھنا لے کر اس میں اطمینان سے آ بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ عین وقت پر ہماری طرح پہنچنے والے مسافر ہر درجہ کے پاخانہ تک میں بھرے ہوئے آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور انجن سے لے کر گارڈ کے ڈبہ تک اور گارڈ

کے ڈبہ سے لے کر انجن تک دوڑنا شروع کرتے ہیں، اگر کسی ڈبے میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے ہیں تو فوراً اس ڈبے کے مسافر ‘‘گو بیک’’ کا نعرہ لگاتے ہیں بلکہ دھکا دے کر دروازہ بھی بند کر دیتے ہیں اسی کوشش میں گاڑی کی روانگی کا وقت آ جاتا ہے اور مسافر جس درجہ میں چاہتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں یہی حال بالکل ہمارا ہوا کہ جب ہم مع اپنے رفقاء سفر کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو ہر ڈبہ میں جلیانوالہ باغ کا منظر تھا ہم نے اور ہمارے 1/4 درجن رفقا سفر نے ہر طرح جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب گارڈ نے بھی اپنے ڈبہ میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تو مجبوراً ہم سب نے ٹکٹ بدلوانے کی ٹھہرائی اور یہ سمجھ کر کہ ٹکٹ کلکٹر خود ٹکٹ بدل دے گا۔ ایک شریفوں والے ڈبہ میں نہایت اعزاز کے ساتھ بیٹھ گئے۔ گاڑی چلی، ہوا آئی پسینہ خشک ہوا تو ذرا حواس درست ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحب تمام مسافروں کے ٹکٹ ملاحظہ فرما رہے ہیں اور ہماری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستے بھی جاتے ہیں ہم پہلے تو اس ہنسی کے معنی نہ سمجھے لیکن جب ان کا تبسم مسلسل ہو گیا تو ہم نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کے دیکھا کہ کون سی ہنسنے والی چیز لگی ہے مگر وہاں حسب معمول ناک، کان، آنکھیں، چشمہ، مونچھیں وغیرہ تھیں ہم سمجھے کہ شاید ناک وغیرہ پر سیاہی لگی ہوگی لہذا ہینڈ بیگ سے آئینہ نکال کر منہ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا، ہم بالکل ویسے ہی تھے جیسے ہمیشہ ہوتے ہیں مگر وہ اب تک ہنس رہے تھے اور اب تو ہم کو ان کی ہنسی پر غصہ بھی آ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان پر غصہ اتاریں وہ ہماری طرف بڑھے اور ہنس کر فرمایا۔

‘‘السلام علیکم شوکت صاحب’’

ہم نے بھی بظاہر خوش اخلاق بن کر جواب دیا ‘‘وعلیکم السلام’’ مگر ہم کو حیرت تھی کہ یہ حضرت ہیں کون؟ لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ان کو پہچان لیں مگر پہچان نہ سکے، ہم محو حیرت ہی تھے کہ انہوں نے پھر فرمایا ‘‘کہئے مزاج شریف’’ ہم نے جواب دیا ‘‘الحمدللہ’’ مگر میں نے آپ کو الہ آباد کے مشاعرے میں اور رسالہ ‘‘ادیب’’ کے عید نمبر میں دیکھا ہے، آپ ایسی چیز نہیں ہیں کہ آپ کو کوئی نہ جانے یہ تو ہم ہی لوگ ہیں کہ خود بھی اپنے کو نہیں جانتے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کا موقع ملا آپ کہاں تشریف لئے جا رہے ہیں۔’’

میں: ‘‘کانپور کے آگے جھانسی جاؤں گا جہاں حامد بھائی رہتے ہیں۔’’

کرو مین: ‘‘بہت مناسب تو کانپور تک میرا بھی ساتھ ہے، جھانسی تو آپ صبح پہنچیں گے۔’’

میں: ‘‘حضرت خوش قسمتی تو یہ ہماری ہے اس لئے کہ ہم کو اپنے ٹکٹ بدلوانا تھے اب آپ بدل دیجئے۔’’

کرو مین: ‘‘اجی چھوڑیئے اس قصہ کو اس قیمتی وقت کو یوں ضائع نہ فرمایئے ٹکٹ بدلے ہوئے سمجھئے۔’’

میں: ''ہمارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے آپ اور آپ کے محکمہ والے جب سمجھیں تو ایک بات بھی ہے۔''

کرو مین: ''شوکت تھانوی کے لئے سب کو یہی سمجھنا پڑے گا آپ اطمینان رکھئے ہم ذمہ دار ہیں۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اب ذرا جان میں جان آئی' بلکہ خوشی ہوئی کہ دام بھی بچے' دیکھئے اگر آج ہم اتفاق سے شوکت تھانوی نہ ہوتے تو دام بھی دینا پڑتے اور جرمانہ بھی اس کے علاوہ خواہ مخواہ جھگڑا ہوتا۔ اب یہ ہوا کہ ان حضرت سے پر لطف باتیں کرتے ہوئے مزے سے چلے گئے انہوں نے ایک مرتبہ کچھ سنانے کی فرمائش کی جس کو ہم نے ٹال دیا مگر جب انہوں نے دوسری مرتبہ اصرار کیا تو ہم کو ان کا احسان یاد آ گیا اور ہم نے ان کو کچھ سنا دیا جس کو ان کے علاوہ ہمارے درجہ کے تمام اردو داں' ہندی داں' انگریزی داں' بلکہ ان لوگوں نے بھی جو کچھ ''داں'' نہ تھے نہایت غور سے سنا اور کان پور پہنچتے پہنچتے ہم اپنے درجہ کے ڈاکٹر اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور بن چکے تھے' کانپور کے سٹیشن پر ہمارے محسن کرو مین صاحب اور سب لوگ اتر گئے اور نئے لوگ آ گئے لیکن چونکہ بارہ سے زیادہ بج چکے تھے لہذا ہم نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سونے کی تجویز پیش کی جو باتفاق منظور ہو گئی لہذا سب دراز ہونے کے لئے کسی سے جنگ کرنا نہیں پڑی اس لئے کہ حامد ندوی بیچارے ندوہ کے سیدھے سادھے مسلمان ہیں لہذا وہ بیٹھے رہے اور کمال نے پیر لٹکا کر آرام کرسی کی طرح لیٹنا مناسب سمجھا حامد ندوی کے برادر عزیز بچوں کی طرح سمٹ کر لیٹ گئے اور ہم سرتا پا بڑے آدمیوں کی طرح دراز ہو گئے یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ نیند آئی لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جاگتے رہے مختصر یہ کہ ''کبھی جاگے کبھی سوئے کبھی سوئے کبھی جاگے اور اسی عالم میں جھانسی پہنچ گئے۔

جھانسی کے سٹیشن پر دور ہی سے حامد بھائی نظر آئے لہذا گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہم سب سے پہلے ان کی طرف جھپٹے اور وہ ہماری طرف بیتابی سے بڑھے مگر متانت کے ساتھ اس لئے کہ ان کے ایک آدھ شاگرد بھی ساتھ تھا ہم دونوں کا ایک مقام پر تصادم ہو گیا جسکو معانقہ کہتے ہیں اس سے فارغ ہو کر ہم تو مسافروں کے اترنے کا تماشا دیکھنے لگے اور حامد بھائی ہمارے ساتھیوں سے ملتے رہے' حامد بھائی کے ساتھ ان کے ایک شاگرد صابر صاحب بھی تھے جو بعد میں معلوم ہوا کہ جھانسی کے بڑے تاجروں میں ہیں اور شاعر بھی ہیں ہم صابر صاحب سے بھی ملے مگر ہم نے ان کی کم سخنی کا اسی وقت اندازہ کر لیا جب وہ ہر بات کا جواب تبسم سے دیتے رہے مگر ان کے خلوص کا سکہ بھی اسی وقت دل پر بیٹھ گیا ہم سب سٹیشن سے باہر آئے اور حامد بھائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سنگ مرمر کی میزوں پر جنٹلمین چائے وغیرہ پیتے ہیں' حامد بھائی نے چائے کا انتظام یہیں کیا تھا' لہذا اس میں بھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہی وقت لگا چائے کے بعد ہم لوگ ایک گاڑی پر بٹھا دیئے گئے اور ہمارا خیر مقدم کرنے والے بائیسکلوں پر سوار ہو گئے' گاڑی کے چلنے

سے پہلے ہم نے گھڑی نہیں دیکھی تھی اس لئے صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ کب ہم لوگ حامد بھائی کے مکان پر پہنچے لیکن اندازاً بتا سکتے ہیں کہ یہ سفر معمولی نہ تھا سٹیشن سے حامد بھائی کا مکان کافی دور ہے لیکن اس میں ان کے مکان کا قصور نہیں ہے وہ بچارہ تو آبادی شروع ہوتے ہی سب سے پہلے ہم کو مل گیا لیکن خود آبادی اتنے فاصلہ پر ہے کہ ایک دوسرا اسٹیشن بنا چاہیے تھا سٹیشن سے مکان تک سڑک کے ہر دو جانب ایسے ایسے نشیب وفراز تھے کہ نشیب ہے تو خندق سے کم نہیں اور فراز ہے تو پہاڑ کے برابر، بس یہ سمجھئے کہ ان ہی نشیب و فراز سے جھانسی بھرا پڑا ہے بلکہ شاید جھانسی کے لغوی معنی نشیب وفراز کے ہیں ہم نے تو تمام راستہ بس پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، جھاڑ، ٹیلے اور پہاڑ دیکھے خود حامد بھائی کے مکان پر پہنچ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب بجلیاں چمک کر ہم کو بے ہوش کر دیں گی اور اس ٹیلہ کو جس پر حامد کدہ واقع ہے جلا کر راکھ کر دیں گی اس وقت ہمارا دل چاہتا تھا کہ طور کے متعلق شاعروں نے جتنے شعر اب تک کہے ہیں سب پڑھ ڈالیں، مکان میں داخل ہو کر اس کرسی پر بیٹھے، اس تپائی پر پیر رکھے، اس کھونٹی پر شیروانی ٹانگنے کے تکلفات نے ہمارے خیالات کو منتشر کر دیا جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہ صبح آٹھ ہی بجے سے اتنا گرم تھا جتنے لکھنو کے کمرے بارہ بجے گرم ہوتے ہیں اور نو بجے سے ایسی لو چلنا شروع ہوئی جیسی لکھنو میں مئی اور جون کے وسط میں بھی نہیں چلتی اس "لو" کے متعلق ہم کو حامد بھائی اور ان کے دوستوں، شاگردوں اور بھائیوں نے ڈرانا شروع کیا کہ یہ لو بڑی خطرناک ہوتی ہے اس کا مارا ہوا سانس بھی نہیں لیتا اور جس کو یہ آگ لگ جاتی ہے پھر زندہ نہیں چھوڑتی وغیرہ وغیرہ مختصر یہ کہ ہم کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ ہم کلمہ پڑھنے لگے اور ہوا کی سرسراہٹ پر ہم کو اپنے متعلق یہی شبہ ہونے لگا کہ ہم پردیس میں آ کر مرحوم ہو گئے، دیکھئے مٹی کہاں کھینچ کر لائی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اور ہمارے ساتھی سب بخیریت رہے، اتنا ضرور ہوا کہ دن بھر کی شدید گرمی سے ہم سب تقریباً نصف ضرور گھل گئے ہوں گے خدا کی پناہ گرمی ہوتی ہے کہ جہنم ہوتا ہے اگر واقعی جہنم جھانسی سے بھی زیادہ گرم مقام ہے تو یقیناً ناقابل برداشت ہے جو لوگ جہنم کو تماشا سمجھے ہوئے ہیں ایک مرتبہ جھانسی ہو آئیں شاید ان کو بھی ہماری طرح گناہوں سے توبہ کرنا پڑے گی، معلوم نہیں یہ جھانسی کے بسنے والے خدا کے بندے کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں، ہم ہوتے تو منجملہ اور پتھروں کے یا تو پتھر ہو جاتے یا جہنم کے داروغہ کی جگہ کے لئے اس حوالہ سے عرضی بھیجتے کہ ہم جھانسی میں رہ چکے ہیں "یعنی ملاحظہ فرمائیے کہ تھوڑی ہی دیر میں جب ہم کو یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم گرمی کی شدت سے بجائے شوکت تھانوی کے ایک شعلہ جوالہ بن جائیں گے تو ہم نے نہایت سرد پانی سے غسل کیا طبیعت ذرا بشاش ہوئی لیکن وہی کیفیت شروع ہو گئی اور شام تک یہی عالم رہا۔ غضب خدا کا اس جھانسی میں رات کو بارہ ایک بجے بھی "لو" چلتی ہے دوپہر کا تو کہنا ہی کیا ہم نے چاہا تھا کہ رات کے جاگے ہوئے لاؤ ذرا دن میں سو لیں چارپائی پر یہی حال تھا کہ

''جو جل اٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے''

کچھ تو اس جہنمی گرمی نے لطف سفر کو بھون دیا اور کچھ انیس وحامد کی علالت سے بے لطفی پیدا ہوگئی تھی، بیچاری آج کل اختناق الرحم کے سخت دوروں میں مبتلا ہیں خدا رحم کرے اور صحت کلی عطا فرمائے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جھانسی کی گرمی ان کے لئے سخت مضر ہے ہم کو تو تعجب ہے کہ وہاں کے مردوں کو اختناق الرحم کے دورے کیوں نہیں پڑتے وہاں تو جو کچھ بھی نہ ہو جائے کم ہے، معلوم نہیں کہ جب حامد بھائی کو جھانسی میں سکونت اختیار کرنا تھی تو انہوں نے شادی کی زحمت کیوں فرمائی یہ بھی کوئی بات ہے کہ پرائی لڑکی کو گھر اور سب چھوڑا کر جھانسی میں رکھ چھوڑا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی علالت سے آپ پریشان بھی ہوتے ہیں مگر صاحب یہ ہندوستان کی عورتیں چاہے حامد میاں کی بیوی ہوں یا مہاتما گاندھی کی بیوی، اپنے شوہر کی ایسی فرمانبردار ہوتی ہیں کہ سبحان اللہ، یہ جھانسی کی گرمی ملاحظہ فرمایئے اور پھر وہاں کے باورچی خانوں کی کیفیت کا تصور کیجئے اس کے بعد اختناق الرحم کے دوروں کو پیش نظر رکھئے اور انیس حامد کا ہم لوگوں کے لئے کھانا تیار کرنا دیکھئے واللہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر مرد عورتوں کی بیویاں ہوا کرتے تو چاہے طلاق ہی تک کیوں نہ نوبت پہنچتی لیکن وہ کام نہ ہو سکتا جو انیس حامد نے کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً دورہ پڑا، ہم اپنے دل میں اپنے کو لعنت ملامت کر رہے تھے کہ یہ سب کچھ ہماری ہی وجہ سے ہوا ہے مگر ہم کو اس کی واقعی اطلاع نہ تھی ورنہ ہرگز نہ جاتے وہ تو کہئے کہ حامد بھائی کے ایک قریبی عزیز عشرت صاحب جو علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں اور مسلم یونیورسٹی میں رہنے کی وجہ سے کھانا نہایت عمدہ پکانے لگے ہیں اس لئے کہ وہاں تو ہر طالب علم بغیر اپنے ہاتھ سے کھانا پکائے زندگی ہی بسر نہیں کر سکتا، اگر وہاں کے کھانے پر پڑا رہے تو تھوڑے ہی دنوں میں یا تو ولی اللہ ہو جائے ورنہ کم از کم مہاتما گاندھی ضرور بن جائے گا اور اگر آلو کی فصل ہے تو چھ مہینہ تک دونوں وقت آلو ہی آلو ملیں گے ہاں تو وہ عشرت صاحب کا علیگ ہونا ذرا کام آ گیا، انہوں نے رات کا کھانا اپنی ''علیگی قابلیت سے ایسا پکایا کہ لطف آ گیا اور اس وقت ہم نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اول تو احساس پر یہ تکلیف نہ تھی کہ انیس حامد نے جس طرح بھی ہو سکا ہے اس کو تیار کیا ہے دوسرے ایمان کی بات یہ ہے کہ کھانا بھی ذرا مزے کا تھا کھانا کھا کر مشاعرہ کی باری تھی اس لئے پانی بھی زیادہ نہیں پیا کہ کہیں پیشاب نہ معلوم ہو۔

جھانسی ایسے کنکولیے پتھریلے مقام میں ذوق شعری پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے لیکن یہ آپ کے صادق صاحب دہلوی اور حامد صاحب شاہجہانپوری کوئی ایسے ویسے تو ہیں نہیں کہ کوہکن کی طرح تیشہ مار کر رہ جاتے انہوں نے یہاں کے پتھروں میں بھی شعریت کی روح پھونک دی ہے اور واللہ ایسا صحیح مذاق پیدا کر دیا ہے کہ ہم تو مشاعرے میں وہاں کے مشاعروں کو دیکھتے تھے

جھانسی کے قلعہ کو دیکھتے تھے اور خدا کی قدرت کا دل ہی دل میں اعتراف کرتے تھے یعنی پتھروں کو ہیرا بنا دیا حضرت دہلی اور لکھنو کے بس میں نہیں ہے وہ تو بس خود جو کچھ ہو گئے ہیں اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنی عزت آبرو لئے چپکے بیٹھے ہیں لیکن جھانسی ایسے مقام پر جا کر اردو شاعری کے اس ارتقاء نے ہم کو بہت متاثر کیا اگر کہیں یہ صادق صاحب دہلوی اور حامد صاحب شاہجہانپوری کچھ دن اور جھانسی میں رہ گئے تو ہم کو ڈر ہے کہ کہیں جھانسی بھی اردو زبان کی مرکزیت کا دعویدار نہ بن جائے' مشاعرے میں نہایت عمدہ عمدہ غزلیں سننے میں آئیں اور خدا کا شکر ہے کہ مشاعرہ بھر میں ''بلبل'' کا نام نہیں آیا سامعین کی تعداد بھی کافی تھی اور سب نہایت شوق کے ساتھ ہمہ تن گوش بن کر بیٹھے ہوئے تھے' مشاعرہ شروع سے آخر تک نہایت کامیاب رہا لیکن آخر میں ایک ''میڈ ان بمبئی'' شاعر نے اپنے غیر طرح کلام سے ایسا لطف اندوز کیا کہ مشاعرے کا تمام لطف لوٹ لے گئے اب تک ان کی آواز دماغ میں گونج رہی ہے اگر وہ ایک دو تین کے بعد چوتھی غزل بھی بغیر کسی فرمائش کے پڑھتے تو شاید ہم کانوں میں انگلی لگا کر جھانسی سے جو بھاگتے تو لکھنو میں آ کر دم لیتے' معلوم نہیں ان حضرت کا کلام کیسا تھا لیکن جس انداز سے وہ گردن کو ہلا کر نغمہ ریزی فرماتے تھے اس کو سننے کے لئے خاص طور پر ہم نے کان نہیں بنوائے تھے' یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ ''غیر طرحی شاعر'' جب بیاض کھول کر بیٹھ جاتے ہیں تو جب تک مشاعرے کے ایک ایک آدمی کو بھگا نہیں لیتے اس وقت تک دم نہیں لیتے یہی حال ان بزرگوار کا بھی تھا ان کا تو شاید دل یہ چاہتا تھا کہ اب تک جتنے شعر کہے ہیں سب سنا دیں لیکن جب سننے والے ایک چوتھائی سے کم رہ گئے تو وہ بھی ''باقی دارد'' کے انداز سے اپنی جگہ پر واپس آ گئے اور ہم نے ٹوپی اتار کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زندگی بھر میں پہلی مرتبہ سچے دل سے الحمد اللہ کہا مگر اتنا ضرور اثر ہم پر ہوا کہ ہم نے مشاعرے کے اچھے اچھے شعر جب یاد کرنے کی کوشش کی تو ایک بھی یاد نہ آیا۔

مشاعرے کے بعد سوائے گھوڑے بیچ کر سونے کے اور کیا کر سکتے تھے' حالانکہ تین بجے رات کو سو کر صبح آٹھ بجے اٹھنا ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا ہے کہ کون سی انسانیت ہے لیکن یہاں انسانیت کا تو سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشاعرہ منعقد کرنے والے' شاعر کو انسان ہی نہیں سمجھتے یا یہ نہیں چاہتے کہ بیچارہ شاعر انسان بنا رہے ورنہ یہ رات کو مشاعرہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے جہاں تک جھانسی کا تعلق ہے وہاں تو رات ہی کو مشاعرہ ہو سکتا ہے اور یہ مشاعرے ہی پر کیا موقوف ہے وہاں زندگی کے تمام مشاغل بس رات کے لئے اٹھا رکھے جاتے ہیں اور دن زندگی سے خارج سمجھا جاتا ہے ہم نے تو وہاں کے باشندے کا جیتے جی اس عذاب جہنم میں مبتلا ہونا دیدہ عبرت نگاہ سے دیکھا اور اس جہنم ارضی کو دیکھ کر دوزخ کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی ہاں تو وہاں اگر مشاعرے رات کو ہوتے ہیں تو خیر ایک بات بھی ہے لیکن دوسرے شہروں میں رات کے مشاعروں کا دستور بیچارے شاعروں کی جماعت کو اشرف

المخلوقات کے اعزاز سے محروم کردینے کی ترکیب ہے یا نہیں؟ لیکن یہ صاحبان مشاعرہ کان کھول کر سن لیں کہ شاعروں کا طبقہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو ان ترکیبوں سے غیر شاعر بنایا جاسکے یہ تو رات کے مشاعرے ہیں اگر یہ دستور ہوجائے کہ ٹھیک 12 بجے جھانسی کے تپتے ہوئے مقام پر مشاعرہ منعقد کردیا جائے تو شاعر کافی تعداد میں شریک ہوگے ہم لوگ شاعر ہیں کوئی دل لگی نہیں ہے۔

مشاعرہ ختم کر کے جو ہم سوئے تو اس وقت بیدار ہوئے جب سورج کی کرنوں نے تمام بدن میں سوئیاں پیوست کردیں اور حامد بھائی کے شاگرد ملال جو اپنے تخلص کے برعکس ایک متبسم فطرت کے نوجوان ہیں اور جن کو میں ہمیشہ شریر ملال کہا کیا' مجھ کو بیدار کرنے کے لئے آئے جی تو چاہتا تھا کہ چھتری لگا کر پھر سو رہیں لیکن ملال کا کیا علاج تھا جو اس مستقل مزاجی سے ''شوکت صاحب شوکت صاحب'' کی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ اگر شوکت صاحب مر گئے ہوتے تو روح کو جواب دینا پڑتا' مجبوراً بیدار ہوئے اور ابھی ضروریات سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ حامد بھائی نے آ کر فرمایا کہ صادق صاحب کے یہاں آپ اس وقت مدعو ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ آپ آٹھ ہی بجے پہنچ جائیں ہم کو یہ اطمینان تھا کہ آٹھ بج ہی چکے ہیں لیکن صادق صاحب کے خلوص کا تقاضا تھا کہ ہم نے تیار ہونے میں غیر معمولی جلدی کی یہاں تک کہ داڑھی بھی ''تشنہ شیو'' رہی اور ہم چائے سے فارغ ہوکر صادق صاحب کے یہاں پہنچ گئے صادق صاحب بیچارے شاعر ہونے سے زیادہ انسان ہیں ہم تو ان کے خلوص کی اس حد تک قدر کرتے ہیں کہ اگر وہ شاعر بھی نہ ہوتے تو ہم کو ایسے ہی اچھے لگتے جیسے شاعر ہونے اور ہماری دعوت کرنے کے بعد اچھے لگے' اس زمانہ میں شاعروں کی کمی نہیں ہے لیکن انسان نایاب ہیں اور جو لوگ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں ان کے متعلق ہماری رائے ہے کہ وہ تو غلطی سے دنیا میں بھیج دیئے گئے ہیں ورنہ ان کی اصلی جگہ تو جنت میں ہے اسی قسم کے فرشتہ صورت انسانوں میں جناب صادق دہلوی کا بھی شمار ہے بہت ممکن ہے کہ زیادہ میل جول اور بے تکلفی کے بعد صادق صاحب اتنے اچھے آدمی ثابت نہ ہوتے جس قدر اس مختصر وقت میں ثابت ہوئے لیکن مختصر وقت میں بھی اچھے آدمی ثابت ہونے والے آج کل کمیاب ہیں صادق صاحب کے یہاں دعوت کے سلسلے میں ایک مختصر سی بزم سخن بھی تھی جس میں سب نے ایک دوسرے کو اپنا کلام سنایا اور داد کا لین دین بالکل اسی طرح ہوا جس طرح اخبارات میں تبادلہ ہوتا ہے۔ دور مشاعرہ کے بعد دور طعام تھا اور چونکہ شعر سنانا بلکہ سننا بھی ایک قسم کی ورزش ہے لہذا اس کے بعد بھوک کا شدت کے ساتھ معلوم ہونا بھی ضروری ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مشاعروں میں دعوت کا دستور کیوں نہیں ہے' اگر مشاعروں میں دعوت بھی ہوا کرے تو یہ کمی بھی پوری ہوجائے او مشاعرے بھی موجودہ صورت سے زیادہ کامیاب ہوں اس لئے کہ شعرا کی کثیر تعداد شریک ہوا کرے بہرحال صادق صاحب کے یہاں کی بزم سخن اس لئے پرکیف تھی کہ اس کے بعد دعوت کا اہتمام تھا

اور دعوت اس لئے پر کیف تھی کہ کھانا لذیذ تھا اور بھوک شدید، شکم سیر ہو کر اس طرح کھایا گویا سات فاقوں کے بعد غذا ملی ہے کھانا کھانے سے پہلے ہی ماسٹر افضل صاحب کا خط آ چکا تھا کہ یہ قافلہ صادق صاحب کے یہاں سے واپسی پر پہلی منزل ان کے در دولت کو بنائے لہٰذا ہم لوگ صادق صاحب سے رخصت ہو کر چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کانوں کو رومال سے باندھے ہوئے اس طرح چلے گویا پیادہ حج کے ارادے سے چلے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم کو ایک آتش سیال کے سمندر میں غرق کر دیا گیا ہے اور ہم لوگ اس سمندر کی تہ میں یہ سفر کر رہے ہیں سڑکوں اور گلیوں سے گزر کر ماسٹر افضل صاحب کے مکان پر پہنچے جہاں پہنچتے ہی ایک ایک کرسی پر اس طرح دراز ہو گئے کہ تہذیب اور اخلاق کا ہوش بھی نہ تھا جب خس کی ٹٹی سے جس کو لوگ گھبراہٹ میں ”ٹٹ کی خسی“ کہہ دیا کرتے ہیں خنک ہوا آئی تو ہم سب کو احساس ہوا کہ ہمارے پیر کدھر ہیں اور سر کدھر، ماسٹر افضل صاحب نے تربوز کا نہایت لطیف شربت منگایا جس کے سرخ پانی میں تربوز کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس طرح پڑے تھے کہ ہماری سمجھ میں پہلی مرتبہ اس شعر کا مطلب آیا۔

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

ورنہ آج تک ہم اس شعر کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ ”اے جاناں تیرے دیوانے کو یہ غذا ملتی ہے کہ وہ خون دل پانی کی جگہ پی لیتا ہے اور اولاد کو کھانے کی جگہ کھا جاتا ہے“ اس لئے کہ لخت جگر ہمارے یہاں اولاد کو کہتے ہیں مگر تربوز کے شربت کو دیکھ کر بلکہ پی کر ہم سمجھے کہ خون دل اس طرح پیا جاتا ہے جس طرح ہم نے شربت پیا اور ”لخت جگر“ اس طرح کھائے جاتے ہیں جس طرح ہم نے ”لخت تربوز“ کھائے اس تربوز کے شربت نے آب حیات کا کام کیا، جان میں جان آ گئی خدا ماسٹر افضل صاحب کا کلیجا بھی ایسا ہی ٹھنڈا رکھے جیسا انہوں نے ہم کو مرنے سے بچا لیا اس ”اکل و شرب“ کے بعد ہم سے کہا گیا کہ ”ہاں چیخوں گلا پھاڑ کر“ یعنی شعر سناؤ لہٰذا ہم نے سنانا شروع کیا اور اس وقت تک سناتے رہے جب تک ہماری آواز اس گراموفون کی سی نہیں ہو گئی جس کی ایک دم سے کوک ختم ہو جائے اس نوبت پر پہنچنے کے بعد ہم کو معاف کر دیا گیا اور ہمارے میزبان نے اپنے دوست مولوی عبدالباری صاحب وکیل جھانسی سے جو خاص طور پر ہماری بکواس سننے کے لئے بلائے گئے تھے کہا کہ اب سیر ہونا چاہیے انہوں نے بھی تائید کی لہٰذا ہم اور حامد بھائی ماسٹر افضل صاحب اور عبدالباری صاحب ایک گاڑی پر جو عبدالباری صاحب کی تھی بیٹھ کر چلے سیر کرنے کو اور سارا جھانسی چھان مارا، اس سیر کے بعد ایک بات ہم کو عجیب و غریب نظر آئی کہ یہ جھانسی کا قلعہ ہر حصہ شہر سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہیں پر ہے یعنی جتنا فاصلہ حامد بھائی کے مکان سے نظر آتا تھا اسی قدر دو تین میل کے فاصلے سے نظر آیا پہلے تو ہم سمجھے کہ یہ قلعہ ساتھ ساتھ چلتا

ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وسط شہر میں واقع ہے لہٰذا ہر طرف سے اور ہر جگہ سے یکساں نظر آتا ہے خواہ مخواہ ہم کو یاروں نے اتنا چکر دیا بس قلعہ کی کسی مینار پر ہم کو لے جاتے وہاں سے ہم تمام شہر دیکھ لیتے اور دیکھنا ہی کیا تھا بس پتھر یا زیادہ سے زیادہ تمام شہر میں صرف ایک مقام پر چند کھجوروں کے درمیان مختصر سا سبزہ دار جس کو جھانسی والے سبزہ زار کہتے ہوں گے' ہم تو خاردار کہنے کو بھی تیار نہیں ہیں' مختصر یہ کہ تمام شہر گھوما مگر وہ دیکھا جو بغیر گھومے ہوئے دیکھ چکے تھے' یعنی پتھر' اس سیر کے بعد مسٹر عبدالحکیم وکیل کے یہاں دعوت تھی عبدالحکیم صاحب شب گزشتہ مشاعرہ کے صدر بھی تھے اور غالباً یہ دعوت حق صدارت ادا کرنے کی علت میں تھی بہرحال ہم کو تو کھانے سے مطلب' پہنچے وہاں بھی اور متھرا کے چوبوں کی طرح شکم سیر ہو کر کھانا کھایا خدا کا شکر ہے کہ عبدالحکیم صاحب کے یہاں کچھ سننا یا سنانا نہیں پڑا' جان بچی لاکھوں پائے' دعوت کے بعد سیدھے گھر آئے' اس لئے کہ اسباب درست کر کے واپس بھی تو ہونا تھا گھر پہنچے اور اسباب درست کیا' بیچارے حامد بھائی میزبانی اور اپنی بیوی کی تیمارداری کے دوہرے فرائض انجام دیتے دیتے دردسر میں مبتلا ہو گئے وہ تو کہیئے کہ ہم دو دن اور ایک رات ہی رہے اگر زیادہ رہتے تو نہیں معلوم کس کس کو کن کن امراض میں مبتلا کر کے چھوڑتے ہم اپنے متعلق نہیں کہتے ہیں' ہماری رائے تو عام شعراء کے لئے ہے کہ وہ طاعون وغیرہ کے قسم کی وبائی امراض سے کم تھوڑی ہوتے ہیں ہاں تو حامد بھائی سے ہم نے کہا استدعا کی التجا کی بھیک مانگی کہ خدا کے لئے اب رحم کیجئے اور جا کر لیٹ رہیئے۔ مگر وہ بندہ خدا ایک نہ مانا اور سٹیشن جانے کے لئے تیار ہو گیا ہم نے ستیہ گرہ کر دی کہ جاؤ ہم بھی نہیں جاتے مجبوراً وہ حضرت سٹیشن نہ جانے پر راضی ہو گئے تانگہ کی جستجو میں حامد بھائی کے شاگرد ہلال صاحب نے جو کمال دکھائے ہیں' وہ یقیناً ایسے تھے کہ اگر وہ لال صاحب سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر ہوتے تو خان بہادری کے خطاب کے بعد انسپکٹر بنا دیئے جاتے' صاحب یہ ہلال صاحب بھی نہایت لاجواب آدمی ہیں۔ بڑی محبت کے' بڑے خلوص کے' بڑی سمجھ کے' بڑی عقل کے اور اس قدر پاکیزہ ذوق رکھنے والے شاعر ہیں کہ کسی زمان میں ''دیوان ہلال'' کا بھی مرقع چغتائی تیار ہو گا اس کا ایک شعر ہم نے سنا اور اس میں ترمیم پیش کی' شعر یہ تھا۔

ان کی تصویر سامنے رکھ کر
اپنا انجام سوچتا ہوں میں

ہم نے ترمیم پیش کی۔

اپنی تصویر سامنے رکھ کر
اپنا انجام سوچتا ہوں

اور دوسری رائے ہم نے ان کو یہ دی تھی کہ تخلص بجائے ”ہلال“ کے یا تو چاند رکھ لیجئے یا چندا، مگر انہوں نے اس کو مذاق سمجھا۔ خیر یہ تو مذاق ہے یا جو کچھ بھی ہے مگر تانگے لے آنا واقعی کمال تھا جس کا اجر ان کو خدا دے گا رخصت کے وقت حامد بھائی کی بیمار بیوی یعنی انیس حامد نے ہم کو ایک زریں بٹوہ دیا جس پر دل چاہتا ہے کہ ایک مستقل مضمون لکھ ڈالیں مگر فی الحال اس کی الائچی اور تمبا کو استعمال کر رہے ہیں، سٹیشن جھانسی پہنچ کر جب ریل میں پہنچے تو کچھ نہ پوچھئے

دیدم به ”در ریل“ عجب شعبدہ کارے
میخانہ بدوشے و گلستان بہ کنارے

اب اس کے بعد سب بوجھ سکتے ہیں کہ راستہ کیسے گزرا ہو گا کاش یہ سفر ختم ہی نہ ہوتا۔

◆◆◆

مشرقی اور مغربی کتا

ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں کبھی رحمت کے فرشتے نہیں آتے اور یہ بات ہمارے ذہن نشین اس لئے ہوگئی تھی کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں کوئی انسان بھی آزادی کے ساتھ نہیں جا سکتا، فرشتے تو پھر فرشتے ہوتے ہیں لیکن ہم اس بات کو کتے کی خصوصیات سے سمجھا کئے کہ وہ اپنے گھر میں گھر والوں کے علاوہ کسی کو نہ آنے دے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا چور باوجود اس کے ہم کو ہمیشہ کو کتے سے پرہیز کرایا گیا کہ اگر کبھی ہم نے اپنے پڑوسی کے نہایت حسین و جمیل پلے پر محبت سے ہاتھ بھی رکھ دیا تو ہمارا ہاتھ فوراً پاک کرایا جاتا تھا اور ڈانٹ الگ سے پڑی تھی اس وقت تو ہم اس احتیاط اور اجتناب کے معنی سوائے بزرگوں کی ضد کے اور کچھ نہ سمجھ سکے تھے لیکن اب ہم کو معلوم ہوا ہے کہ منجملہ اور جہالتوں کے ہندوستانیوں کی ایک افسوسناک جہالت کتوں سے نفرت کرنا بھی ہے تمام ہندوستانی تو خیر کتے کو جانور سمجھ کر وہی درجہ دیتے ہیں جو جانور کو دینا چاہیے لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ کتے سے ایک قسم کی رقابت سلسلہ جاری ہے اگر وہ بے چارہ کپڑوں سے چھو جائے تو کپڑے نماز کے قابل نہیں رہتے اگر پاؤں چاٹ لے تو یہ پاؤں کاٹ لیں گے ورنہ کم از کم دھو ضرور ڈالیں گے۔ مختصر یہ کہ یہ مسلمان کتوں سے دور بھاگتے ہیں حالانکہ مغربی اقوام نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان بغیر کتے کی معیت کے کبھی مکمل انسان نہیں بن سکتا، اس وقت تمام مہذب اقوام کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے کو مہذب ثابت کرنے کے لیے کتا ضرور ہمراہ رکھتی ہیں کوئی جنٹلمین بغیر کتے کے کبھی مکمل جنٹلمین نہیں ہو سکتا کوئی لیڈی بغیر کتا بغل میں دبائے کبھی لیڈی نہیں ہو سکتی، کوئی موٹر بغیر کتے کے موٹر نہیں ہوتا، اور کوئی مکان بغیر کتے کے دولت خانہ نہیں سمجھا جاتا۔

ہندوستانیوں کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اس کے سر پر، گود میں، آگے، پیچھے، ادھر یا ادھر ایک ہانپتا ہوا زبان نکالے دم ہلاتا ہوا کتا ضرور ہوگا اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو کچھ یوں ہی سا ہے مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کتے کے ان کو لطف زندگی ہی حاصل نہیں ہوتا جب تک ان کی نرم اور معطر آغوش میں ایک پلہ نہ دبا ہو وہ اپنے عدم اور وجود کو یکساں سمجھتی ہیں اور اگر پلہ دبا ہوا ہے تو اس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے اسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دبوچتی ہیں کہ ان کے عشاق کتا بن کر نہ پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کتا بن جانے کے لئے دست

بدعا ہو جاتے ہیں ورنہ یہ بات تو اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ محبوبہ کے کتے کو موقع پا کر محبت سے اٹھا لینا ایک قسم کی ''تقریب کچھ بہر ملاقات'' ہوا کرتی ہے۔

سگ لیلیٰ صرف ایک کتا تھا جو قیس کے لئے عظمت کے اعتبار سے خواہ ہاتھی کے برابر ہو یا اونٹ کے برابر' مگر دوسروں کے نزدیک وہ ایک کتے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا لیکن مغربی ممالک میں سگ پرستی کا یہ حال ہے کہ انسان کی جگہ کتوں کو اشرف المخلوقات تسلیم کر لیا گیا ہے اور کتوں کو وہ درجہ حاصل ہے جو انسان کو بھی حاصل نہیں' مغربی ممالک کی وہ مرمریں پریاں جن کی جلوہ گرناز میں تصور کا بھی مشکل سے گزر ہوتا ہے ان ہی کی نرم اور معطر آغوش میں وہی حقیر اور ذلیل کتا ہوتا ہے جس کو ہم بدتمیز ڈھیلے مار کر بھگا دیا کرتے ہیں اور آفتاب کی وہ زریں شعاعیں اپنے دست رنگین ان ہی کتوں پر پھیرتی ہیں جن پر ہاتھ اتفاق سے پڑ جانے کے بعد ہمارا وضو ٹوٹ جاتا ہے اگر تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتایا جائے کہ نازنینان مغرب کتوں کے ساتھ کس کس طرح محبت کرتی ہیں تو شاید بہت سے ہندوستانی دل ہی دل میں جل کر کباب ہو جائیں بہر حال مختصر طور پر صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ حسن مغرب کے شراب ریز لبہائے رنگین محبت سے کانپتے ہیں اور کتوں کے لعاب ریز لبوں سے پیوست ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ارے توبہ سچ ہے!

قدر سگ انگریز داند یا بداند اس کی میم

ہم غیر انگریز ''سگ ناشناس'' کتوں کی کیا قدر کر سکتے ہیں جن کو ہوش سنبھالتے ہی یہ سبق پڑھا دیا گیا ہے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے' کتا رکھنا گناہ ہے' کتا رحمت کے فرشتوں کو گھر میں نہیں آنے دیتا۔ آخر یہ مہذب اقوام بھی تو عقل رکھتی ہیں وہ کیوں کتوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہیں ہم آپ جن کتوں کو بیکسی کی حالت میں سڑکوں پر پڑا ہوا اور راہ گیروں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھتے ہیں ان ہی کے بھائی بند جو خوش قسمتی سے یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوتے ہیں حقیقتاً اشرف المخلوقات نظر آتے ہیں ہم تو کہتے ہیں کتا کیسا ہی حقیر یا ذلیل کیوں نہ ہو' لیکن اگر دنیا کا لطف اٹھانے کے لئے کسی کو پیدا کرنا ہے تو فطرت کو چاہیے کہ مغربی ممالک کا کتا بنا کر پیدا کرے ورنہ عذاب بھگتنے کے لئے ہندوستان کا کتا یا آدمی دونوں یکساں ہیں۔ دیکھتے جایئے وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کے تمام گلیوں میں پڑے ہوئے کتے مغربی ممالک میں پہنچ جائیں گے' اس لئے کہ وہاں کی ہر ماں کو اپنے یہاں بابا کے پیدا ہوتے ہی ایک پلے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو تمام دنیا کے کتے سمٹ کر مغربی ممالک میں عیش کی زندگی بسر کریں گے اور ہندوستانی عموماً اور مسلمان خصوصاً کتوں کو دیکھنے کے لئے ترس جائیں گے۔

◆ ◆ ◆

واحد حاضر جمع غائب

رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان کو اپنے مضمون نگاروں کی طرف سے ایک غلط فہمی ہمیشہ رہا کرتی ہے کہ وہ حسب فرمائش ہر وقت اسی نمبر کا اسی ڈیزائن کا اور اسی نوک کا مضمون تیار کر سکتے ہیں جس کی فرمائش کی جائے لیکن ہمیشہ وہ مضمون دینے میں ”وعدہ وصل“ کی طرح ”فردائے قیامت“ سے کام لیتے ہیں ایڈیٹر صاحبان کا یہ خیال ذرا غلط ہے اس لئے کہ مضمون لکھنے میں بھی ناکام رہتے ہیں' کاغذ حاضر' قلم حاضر' دوات حاضر' تو دماغ غیر حاضر' اب دماغ حاضر ہوا تو کاغذ قلم دوات غیر حاضر اور واقعی بنارسی باغ میں قلم' دوات کاغذ کیسے حاضر ہو سکتے ہیں اور گھر میں جہاں قلم دوات کاغذ وغیرہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے وہاں دماغ اتفاق سے حاضر نہیں ہوتا۔ غرضکہ اسی حاضر غائب کی گردان میں مضمون ملتوی رہتا ہے اگر جمع حاضر ہے تو واحد غائب اور اگر واحد حاضر ہے تو جمع غائب' لیکن ایڈیٹر صاحب اس تاخیر سے سمجھتے ہیں کہ مضمون نگار صاحب ناز' نخرہ غمزہ کر رہے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ ایک مضمون لکھنے کے لئے کتنی مرتبہ واحد حاضر اور غائب کی گردان کرنا پڑتی ہے اور اس کے علاوہ بہت سی افتادیں اور بھی ہیں جو انسان پر آئے دن نازل ہوا کرتی ہیں مثلاً اسی مضمون کا قصہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر کو پہلا ارادہ کیا کہ مضمون لکھیں۔ یاد آ گیا کہ لاحول ولاقوۃ عرصہ ہوا کہ راز کا خط آیا تھا' جواب نہیں دیا پھر خیال آیا کہ جگر کے خط کا بھی جواب نہیں دیا ہے اور ہاں اس نے اناؤ بلایا تھا اچھا اب کی اتوار کو جائیں گے اتنے میں آ گیا دھوبی' اس سے پاجامہ کھولنے کی شکایت' قمیض پھاڑنے کے شکوے' کالر پھولنے کے گلے شروع ہو گئے' کھانے کا وقت آیا وہ بھی ٹل گیا' ہاتھ دھو کر انگڑائی لیتے ہوئے ذرا آنکھ جھپکانے کو لیٹ رہے اور چار بجے کی خبر لی' اٹھے غسل کیا اور آوارہ گردی کو نکل گئے' غرضکہ تمام دن اور تمام رات صرف کر کے دوسری ستمبر کو پھر علی الصباح مضمون کا خیال آیا حافظ محمد عالم صاحب کی برہمی کا افسوس ہوا خیال کیا کہ لاؤ فسانہ لکھیں' بس شروع کر دیا' فسانہ ساتھ نام اللہ کے نام رکھا ”تریاہٹ“ اور فسانہ لکھنا شروع ہوا' ماشاءاللہ کوئی دس منٹ میں پہلا باب ختم کر ڈالا اور قلم رکھ کر ذرا کمر سیدھی کی بس فسانہ ختم اب سوچا اچھا ذرا لیٹ کے نظم کہیں۔

دوسرے مصرعے کے الفاظ ذہن میں اچھی طرح آنے بھی نہ پائے تھے کہ انہوں نے شانہ ہلا کر کہا۔ ”آج دفتر جانا ہے یا نہیں؟ نو بجے کو ہیں۔“ بس جناب شاعری وغیرہ سب تشریف لے گئی' کپڑے پہنے' جلدی جلدی کھانا کھایا' چائے بہت گرم تھی اس کو یوں ہی چھوڑا اور ٹوپی پہنتے ہوئے یہ جا وہ جا دفتر پہنچ گئے دفتر میں وہی روز کا چرخہ' پانچ بجے گھر کو آئے تو دن بھر کے تھکے ہوئے تن بدن کا ہوش

کہاں بس چاروں شانے چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں وہ اللہ کی بندی پنکھا جھلا کی اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اب روز اسی طرح دفتر جاتے رہے فسانہ کا ایک باب اور نظم کا ایک مصرعہ لکھا ہوا اب تک رکھا ہے اس کو پورا کون کرتا ہم تو دفتر جاتے رہے اور دفتر سے آ کر جو حال ہو جاتا ہے اس کو وہی مضمون نگار خوب سمجھ سکتے ہیں جو کسی روزانہ اخبار کے دفتر میں ہماری طرح نوکر ہوں دن بھر سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں دماغ گاندھی کا چرخہ ہو جاتا ہے پھر بدیشی مضامین کس سے لکھے جائیں مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ارادہ برابر کرتے رہے کہ اب کی کوئی تعطیل آئے تو مضمون یا نظم لکھ ہی ڈالیں گے، تعطیل کونسی آتی اخبار اور تعطیل، دو ایسی تلواریں ہیں کہ ایک نیام میں رہ ہی نہیں سکتیں، بہرحال خدا اتوار کو سلامت رکھے کہ ہفتہ بھر کا پروگرام اسی ایک دن پر ٹلتا ہے۔ نہانا، دھونا، کپڑے بدلنا، دوستوں اور عزیزوں سے ملنا، اناؤ جانا، مضمون لکھنا، غرضکہ سب کچھ اتوار کے دن کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور اتوار کو دن بھر صرف سوتے ہیں، لیکن ابکی بالکل طے تھا کہ ”عالمگیر“ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس ارادہ کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جمعہ کے دن بخار ہو گیا ہفتہ کو 103 تک پہنچ گیا اور اتوار کو تو ڈاکٹر صاحب کا موٹر گھر پر کھڑا تھا، ڈاکٹر صاحب نبض دیکھ رہے تھے پیٹ دیکھ رہے تھے، سینہ ٹھوک بجا کر دیکھ رہے تھے اور ہم ڈاکٹر صاحب کا منہ دیکھ رہے تھے کہ دق تجویز نہ کر دیں مگر انہوں نے ملیریا فرمایا، نسخہ لکھا، فیس تو ہمارے یہاں لیتے نہیں ہیں، یوں ہی چلے گئے نسخہ پیا یعنی نسخہ کی دوا ایسی کڑوی اور تیز کہ بجائے حلق میں اترنے کے پہلے دماغ میں تشریف لے گئی پھر تیر کی طرح حلق سے اتر کر تمام گلے میں شگاف کرتی ہوئی معلوم نہیں پیٹ کے کس حصہ میں پہنچی مگر تمام بدن میں آتش سیال کی طرح ایک سوزش پیدا کر گئی اب تک اس کا مزہ یاد کر کے تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں دوزخ میں شاید یہی پانی کی جگہ گنہگاروں کو دی جائے گی، ہر تیسرے گھنٹے کے بعد اس کی ایک خوراک سے تواضع ہوتی رہی کمبخت نے پیٹ ایسا صاف کیا کہ صرف آنتوں کا برآمد کرنا چھوڑ دیا اور وہاں ڈاکٹر صاحب نے مقاطعہ جوئی کا حکم بھی دے دیا صرف دودھ جس سے مجھ کو ہمیشہ نفرت رہی ہے استعمال کرنے کو فرمایا مگر بخار اس سے بھی نہ گیا بلکہ 104 ہو گیا اور آخر کار 105 تک پارہ پہنچ گیا اب تو ہم ذرا مرحوم ہونے کے تصور میں گھبرائے، وصیت شروع کی در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی کلمہ پڑھا اور سچے مسلمان کی طرح توبہ استغفار شروع کر دی، ڈاکٹر صاحب پھر طلب کئے گئے انہوں نے پھر وہی نبض دیکھی، قلب کی حرکت کا معائنہ کیا، زبان دیکھی، آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور فرمایا کہ بخار ملیریا نہیں ٹائیفائیڈ ہے چودہ دن کے بعد اترے گا نسخہ تبدیل کر دیا دوا آئی نہایت خوش رنگ ہلکا ہلکا، نارنجی رنگ، کاگ کے کھلتے ہی بھینی بھینی خوشبو آئی کہ دماغ معطر ہو گیا لیکن جیسے ہی منہ میں پہنچی معلوم ہوا کہ تیزاب پی لیا زبان اینٹھ کر رہ گئی حلق جکڑ گیا تمام بدن میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو حواس ہی بجا نہ

رہے جب کلی کی تو پتہ چلا کہ مزہ کیسا تھا کڑوا اور نمکین، کھٹا اور میٹھا، سب یکجا، خدا اس دوا سے اپنے ہر بندے کو بچائے، ہم تو خیر بچے نہیں لیکن ہمارے دوسرے برادران ملک وملت اس دوا سے محفوظ رہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہوا کہ شاید ملک الموت روح قبض کرنا بھی بھول جائے مگر ہماری تیمارداری صاحبہ دوا کا وقت نہیں بھولتی تھیں جہاں پہلی خوراک کو تین گھنٹے ہوئے اور وہ اپنے ایک ہاتھ میں دوا کی شیشی اور دوسرے میں فیڈنگ کپ اور پان لئے سر پر موجود، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے دوا کے ان کی صورت سے متلی ہونے لگی بخار ایسی تکلیف دہ چیز نہیں ہے اس میں تو تھوڑا سا لطف آتا ہے بشرطیکہ سر میں درد نہ ہو، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب ذرا زیادہ پی لی ہے لیکن یہ تمام نشہ ہرن کر دیتی ہے اول تو صرف کنین ہی کیا کم ہے اس پر سے اور نہیں معلوم کیا کیا خرافات ملا کر اس کو مکمل زہر بنا دیا جاتا ہے۔ منہ کا مزہ مستقل طور پر کڑوا کر دینے والا میری رائے میں بخار نہیں ہوتا بلکہ یہ دوائیں ہوتی ہیں اور پھر معالج صاحب کس انداز سے پوچھتے ہیں "منہ کا مزہ کیسا ہے؟" جی چاہتا ہے کہ دوا کی ایک خوراک پلا کر کہے کہ "ایسا ہے" روز ڈاکٹر صاحب کو حال لکھوا کر بھجوا رہے ہیں کہ شاید دوا بدل لیں، لیکن جواب یہی ملتا ہے کہ دوا بدستور، غذا بند اور یہ پوڈر صبح وشام پانی سے پیا جائے لیجئے دوا تو تھی ہی ایک پوڈر کا بھی اضافہ ہو گیا، یعنی گئے تھے نماز بخشوانے، روزے بھی ساتھ ہو لئے۔۔۔۔۔۔ خیر پوڈر تو ایسی چیز نہیں ہے جس کا اثر دیرپا ہو ایک آدھ جھرجھری کے بعد جہاں پان کھایا پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ پوڈر بھی کھایا تھا یا نہیں لیکن دوا تو سوتے ہوئے بلکہ مرے ہوئے آدمی پر اگر چھڑک دی جائے تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہو اور اگر زندہ کو پلا دی جائے تو ہوائی جہاز بن کر اڑ جائے، لیکن ہم ایسے سخت جان ہیں کہ دن میں تین مرتبہ پیتے ہیں اور تین مرتبہ منہ بنا کر ہاتھ پیر ادھر ادھر مار کر رہ جاتے ہیں لیکن نہ بخار کم ہوتا ہے نہ دوا چھوٹتی ہے بخار کو دس دن ہوئے مگر کم نہ ہوا، ڈاکٹر صاحب کے فرمان کے مطابق گویا چار دن کی مصیبت اور تھی لیکن گیارہویں دن بخار کم ہوا تھرمامیٹر کا پارہ خلاف عادت صرف ایک سو تک چڑھ کر رہ گیا لیکن نہیں معلوم یہ کیا بات ہے کہ بخار کے کم ہونے سے ایک تو کمزوری کا احساس زیادہ ہوتا ہے دوسرے غصہ زیادہ آتا ہے لہٰذا آج کمزوری زیادہ محسوس ہوئی اور بات بات پر غصہ آیا سب سے زیادہ غصہ تو دوا کے اوقات پر آیا دوا پینے پر تو از روئے قاعدہ غصہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا پان چھوٹا ہونے پر بستر پر شکن پڑنے پر، ناک پر مکھی بیٹھنے پر بچوں کے زور سے چلنے پر باری باری غصہ کرتے رہے اتنے میں کسی نے کہہ دیا کہ نل میں اب تک پانی نہیں آیا ہے بس ہم نے میونسپلٹی پر، چیئرمین پر، واٹر ورکس پر غصہ شروع کیا پانی آ گیا تو نل بند کرنے پر غصہ کر لیا، نل بند ہوا تو بوندیں ٹپکنے پر غصہ کر لیا، غرضیکہ جو بات مل گئی اس پر غصہ کر لیا حالانکہ کمزوری کی وجہ سے آواز نہیں نکلتی تھی لیکن پھر بھی غصہ کمزور آواز کو شاندار بنا دیتا تھا لہٰذا ہم گھر بھر کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے جب ہم نے غصہ کی حد کر دی تو انہوں نے مجبور ہو کر کہا۔ "اچھا بس ہو چکا غصہ، چپکے پڑے رہو۔" ہم کروٹ لے

کرچپ ہورہے اب جو تھرمامیٹر لگایا گیا تو بخار وہی ایک سو تین تھا سب نے کہا، غصہ سے بڑھ گیا کسی نے کہا کمزور تو ہو رہا ہے ہیں اتنا بکے کہ بخار بڑھ گیا یہ کسی نے نہ کہا کہ ابھی دوا پی ہے، دوا سے بڑھ گیا ہوگا۔ ایک سو تین بخار کے ہونے سے ہم پر وہی سابقہ کیفیت طاری ہوگئی کہ خاموش پڑے ہوئے اچھے ہو جانے کے بعد کی بدپرہیزیوں کا تصور کرکے دل خوش کرنے لگے کہ کوئی دعوت انشاءاللہ ناغہ نہ کریں گے، بلکہ ان دوستوں کے یہاں ضرور جائیں گے جہاں پرتکلف چائے سے تواضع ہو اس کے ساتھ مٹھائیاں ہوں اور جب اچھے ہو جائیں گے تو لاہور جائیں گے، حافظ محمد عالم صاحب دعوت ضرور کریں گے اور دوست بھی دعوت دیں گے اتنی طویل علالت کا کفارہ ہو جائے گا یہی غور کرتے کرتے غنودگی طاری ہوئی معلوم نہیں خواب میں کیا کیا دیکھا کہ ایک دم سے اچھل پڑے، آنکھ کھلی تو دوا کا وقت تھا فرشتہ دوا لئے کھڑا تھا “پی دوا” پیتے نہ تو کہاں جاتے، زمین سخت اور آسمان دور، غرضکہ اسی طرح دو دن اور کٹے چودھویں دن صبح کو بخار نارمل تھا بہت خوش ہوئے آج صبح دودھ کے ساتھ ٹوسٹ بھی ملا لیکن غالباً اتنے دنوں تک مقاطعہ جوعی کرنے کے بعد آنتیں خشک ہوگئی تھیں۔ ٹوسٹ کی طرف کچھ رغبت نہیں ہوئی بہرحال کھایا اور رازق مطلق کا شکر ادا کیا ڈاکٹر صاحب کو خوشخبری لکھی لیکن اس کے جواب میں بھی “دوا بدستور” حکم آیا صبر کرکے رہ گئے۔ اس لئے کہ اب تو زیادہ سے زیادہ دو ایک دن کی بات اور تھی پھر ہم کو کون دوا پلاتا ہے ڈاکٹر صاحب ہوں یا ہماری تیمارداری ہم کس کے ہاتھ آنے والے ہیں ابھی تو یہ حال ہے کہ خوشامد کرتے ہیں باتیں بناتے ہیں مگر پھر بھی دوا پینی پڑتی ہے وہ دوا لائیں اور ہم نے خوشامد شروع کی کہ آپ کے رسالے “سہیلی” کا دفتر بھی لاہور آ گیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ “معلوم ہے دوا پیجئے” لیجئے ہم نے تو ان کی دلچسپی کی بات کہی تھی انہوں نے ٹکا سا جواب دیا کہ “معلوم ہے دوا پیجئے” یہ بھی کوئی انسانیت ہے؟ مگر کیا کریں سب کچھ سہنا پڑتی ہے بخار نارمل ہوا مگر کمزوری بڑھ گئی، نقل و حرکت سے معذور، بستر پر پڑے ایک ایک کا منہ دیکھ رہے ہیں اچھے ادیب، اچھے شاعر ہیں، اچھے اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ “ہمدم” ہیں کہ نہ اٹھنے کے نہ بیٹھنے کے، پندرہویں دن مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی کھانے کو ملی۔ کھچڑی کھائی بس ذرا سی مگر آنکھیں کھل گئیں، سب سے پہلے مضمون کا خیال پھر حافظ محمد عالم صاحب کا خیال پھر عالمگیر کے خاص نمبر کا خیال بائیسکوپ کے فلم کی طرح ذہن میں آئے مگر اٹھ ہی نہ سکے شام تک متواتر ارادہ کرنے سے دیوار کے سہارے تھوڑی دور اس بچے کی طرح چلے جو چلنا سیکھ رہا ہو لیکن شکر ہے کہ اس طرح گرے نہیں اور واپسی تو دو آدمیوں کے سہارے سے ہوئی، آج سترہواں دن ہے تو ہم نے جس طرح بھی ہوا لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھ ڈالیں اب قلم رکھ کے جو آنکھیں بند کرکے لیٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ آنجہانی ہوگئے اس لئے کہ کافی خستگی ہو چکی ہے مگر حافظ محمد عالم صاحب تو ہم کو سمجھے ہوئے ہیں، مضمون نگار، ان کو کیا معلوم کیا مضمون نگار ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر دراز بھی ہو سکتے ہیں ان کے ڈر کے مارے جو

کچھ لکھا جا سکا ہے لکھا ہے۔ مگر یہ باور کرانے کی آخری کوشش کرتا ہوں کہ یکم ستمبر کا ارادہ جو اتفاق سے بغیر انشاء اللہ کے کیا تھا ابھی فسانہ کے ایک باب اور نظم کے ایک مصرع کی صورت میں بکس میں بجنسہ موجود ہے جو انشاء اللہ ہاں اب کی انشاء اللہ کہہ دیا' معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے تو انشاء اللہ وہ باب اور وہ مصرع آئندہ سالانہ نمبر کے لئے کام آئے گا' خاص نمبر کے لئے یہ لیجئے۔

◆ ◆ ◆

شاہکار

شاہکار کے معنی کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہ جانتا ہوگا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سے بڑھے لکھوں کو پنجاب کے رسائل نے باور کرا دیا ہے کہ شاہکار کے معنی سوائے چغتائی کی تصاویر اور پنجابی رسائل کے خاص نمبروں کے مضامین کے اور کچھ نہیں ہیں بلکہ بہت سے پنجابی رسائل کے ناظرین تو آنکھ بند کر کے شاہکار کے معنی یہ بتائیں گے کہ شاہکار اس قلمی تصویر کو کہتے ہیں جو خطوط سے اس طرح بنائی گئی ہو کہ ٹانگیں حلق تک لمبی ہوں اور اوپر کا دھڑ جہاں سے شروع ہوا ہو وہیں پر ختم ہو جائے' دبلے پتلے اور لمبے ہاتھوں میں ہاتھوں سے زیادہ لمبی انگلیاں ہوں اور ہر انگلی اس جدو جہد میں نظر آئے کہ میں لمبان میں بڑھ جاؤں پیر اول تو نظر نہ آئیں اور آئیں تو ایسے کہ ان کے لئے اٹھارہ نمبر کے جوتے کی ضرورت ہو' چہرہ بھی گھوڑے کی طرح لمبا ہو جس پر دہانہ کے خفیف سے نشان پر ایک لمبی سی ناک رکھی ہو اور آنکھیں بند ہوں' لباس ایسا ہو کہ اس کو کفن کے علاوہ اور کچھ نہ کہا جا سکے۔ منظر ایسا ہو کہ طاق پر شمع روشن ہو جس کا پروانہ تصویر کی ناک پر تشریف فرما ہو اور بحیثیت مجموعی تصویر میں سوائے ناک کے کچھ نظر نہ آئے' ایسی تصویر کو شاہکار کہتے ہیں یا شاہکار کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ مضمون جو لاہور اور امرتسر کے رسالوں کے سالناموں' سالگرہ نمبروں' عید نمبروں اور خاص نمبروں میں شائع ہو اس کو مدیر رسالہ اپنے شذرات میں پیار سے شاہکار لکھتا ہے مختصر یہ کہ شاہکار کو کثرت استعمال نے جتنا مانوس بنایا ہے اس سے کہیں زیادہ غیر مانوس بنا دیا ہے اگر آج ہم شاہکار اس کے صحیح محل پر استعمال کرنا چاہیں تو سب ہم کو بیوقوف بنائیں گے لہذا ہم بیوقوف بننے کے ڈر سے اس کا نام بھی نہ لیں گے اور ہماری خاموشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب سو دو برس کے بعد زبان اردو کی کوئی کتاب لغات مرتب ہوگی تو شاہکار کے معنی لکھے جائیں گے کہ ایک ایسا جانور تھا جو پنجاب میں پایا جاتا تھا اور اب نایاب ہے۔

وہ تو کہیئے کہ پنجاب کے رسائل نے شاہکار کے معنی ہمارے ذہن نشین کر دیئے ہیں اور اس کے کثرت استعمال نے ہمکو مجبور کیا کہ ہم اس کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی اپنے ذہن میں رکھیں' ورنہ ہمارے پاس کوئی جواب ہی نہ ہوتا جب ننھے سعید نے نہایت معصومیت سے پوچھا کہ حضرت شاہکار علیہ الرحمۃ کون بزرگ تھے اور ان کا مزار کہاں ہے؟'' ہم نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس سوال کا جواب معقول دے دیا ورنہ سوائے اس کے کیا کہتے کہ ''حضرت حافظ شیرازی کے چھوٹے بھائی کا نام شاہکار تھا جن کے حالات سوائے میرے کسی کو نہیں معلوم' لیکن ہم نے سعید کو نہایت شفقت سے قریب بٹھا کر لیکچر دینا شروع کیا کہ سنو۔

''آج کا موضوع شاہکار ہے' یہ ایک لفظ ہے جس کی تم انسانی نام سمجھے یہ کسی انسان' جانور' جگہ یا چیز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک لفظ ہے جس کو انگریزی میں ماسٹر پیس (MASTER PIECE) کہتے ہیں اور جن کا تھوڑا بہت مفہوم لفظ کارنامہ سے ادا ہوتا ہے اس لفظ کے معنی ہیں کارناموں بادشاہ اس لئے کہ ''کار'' کہتے ہیں کام کو۔ اور اگر کار کے معنی موٹر کار لئے جائیں تو شاہکار کے معنی ہوں گے ''مسٹر فورڈ'' لیکن چونکہ یہاں اردو زبان کے لفظ ''کار'' سے بحث ہے لہٰذا اس کا ''کار'' کے معنی ہیں کام اور جب اس میں ''شاہ'' لگا دیا گیا تو یہ ہوگیا ''شاہ کار'' یعنی کاموں کا شاہ اس کو اس طرح سمجھو کہ مثلاً تم نے اپنی اس مختصر زندگی میں سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنی ہوائی بندوق سے فاختہ مار ڈالی' اس فاختہ کے شکار کو تم اپنا شاہکار کہہ سکتے ہو اسی طرح میرے شاہکار تم خود ہو مہاتما گاندھی کا شاہکار چرخہ ہے مولانا محمد علی کے شاہکار مولانا شوکت علی ہیں' انگریزوں کا شاہکار کنگ پرائمر ہے۔ ہندوستان کا شاہکار تاج محل ہے۔ تاج محل کے شاہکار مولانا سیماب ہیں۔ مولانا سیماب کے شاہکار ساغر نظامی یا راز چاند پوری ہیں اسی طرح ہر شخص کا کوئی نہ کوئی شاہکار ہوتا ہے لیکن ایک شخص کے دو شاہکار پنجاب میں تو خیر عام طور پر ہوتے ہیں لیکن غریب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں ذرا مشکل سے ہوتے ہیں۔ غالباً اب سمجھ گئے ہوگے کہ شاہکار کس کو کہتے ہیں تم کہتے ہوگے کہ تاج محل کیوں شاہکار ہے اور قطب مینار کیوں نہیں ہے اس کو یوں ہی رہنے دو' بات یہ ہے کہ اس میں اپنی اپنی پسند کا سوال آجاتا ہے بعض کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال شاہکار ہیں اور بعض ڈاکٹر ٹیگور کو شاہکار کہتے ہیں تو بھائی اس قصہ کو اپنے دل پر چھوڑ کر ایک شاہکار سمجھ لو اب دیکھو کہ تم شاہکار سمجھتے تھے کسی بزرگ کو جیسے شاہ مینا علیہ الرحمۃ یا شاہ پیر محمد صاحب وغیرہ' لیکن شاہکار کوئی بزرگ نہیں اور نہ اس کا شمار شاہ دیمک قسم کے کیڑوں سے ہے یہ ایک لفظ ہے جس کے معنی تم سمجھ گئے ہوگے۔''

ہمارا لیکچر ایسا تھا کہ سعید تو خیر ماشاء اللہ ذہین ہے اگر کسی پتھر کی مورت کے سامنے دیا جاتا تو وہ بھی لفظ ''شاہکار'' کی متبحر عالم ہو جاتی' لیکن ہم کو تعجب ہی ہوا جب سعید نے سب کچھ سننے کے بعد پوچھا کہ

''لیکن شاہکار تو ایک سدا سہاگن بزرگ تھے جو زنانہ لباس میں رہتے تھے''

ہم نے پھر متعجب ہو کر پوچھا کہ ''اس کے کیا معنی ہوئے'' اس نے ایک پنجابی رسالہ ہمارے سامنے پھینک کر کہا ''یہ دیکھئے اس میں شاہکار کی تصویر ہے' اب ہمارے لئے یہ سمجھانا بہت دشوار تھا کہ شاہکار کی تصویر نہیں ہے بلکہ شاہکار تصویر کو کہتے ہیں لہٰذا ہم نے بھی کہہ دیا کہ پنجاب میں شاہکار تصویر کو کہتے ہیں اور باقی تمام ہندوستان میں اس کے معنی وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں اس نے کچھ اس طرح ان الفاظ پر اعتبار کیا گویا وہ مجھ کو جاہل سمجھ رہا تھا اور پاس ادب جاہل کہنے میں مانع تھا۔

سعید کو تو خیر ہم نے کسی نہ کسی طرح خاموش کر دیا مگر ہم کو اپنی نا اہلی کا اعتراف ہے کہ اگر کسی پڑھے لکھے یا کسی پنجابی بھائی کو سمجھانا پڑے تو ہم کچھ نہیں سمجھا سکتے اور واقعی کس طرح سمجھا سکتے ہیں جب پنجاب کے کثیر الاشاعت رسائل نے ہم سے پہلے یہ اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے کہ شاہکار ہندوستان کے مایہ ناز مصور چغتائی کی تصویر کو کہتے ہیں کم از کم ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ اگر پنجاب کے رسائل مانی اور بہزاد کے بھی کسی شاہکار کو شاہکار لکھ دیں گے تو ہم بغیر دیکھے ہوئے اس تصویر کو مان لیا کریں گے اور اگر ہمارے کسی مضمون کو پنجاب کے کسی رسالہ نے شاہکار لکھ دیا تو ہم اس مضمون کے متعلق اعلان کر دیں گے کہ ہمارا مضمون نہیں ہے کسی نے ہمارے نام سے لکھ دیا ہے ایک غلط فہمی اور بھی امکان میں ہے کہ شاید لوگ یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم شاہکار سے چڑتے ہیں یا چغتائی کی تصویر ہم کو پسند نہیں یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ چغتائی ہندوستان کا مایہ ناز مصور ہے اور اس کی تصاویر نہیں بلکہ وہ خود شاہکار ہے اور فطرت کا شاہکار ہے لیکن اس کی ہر تصویر کو شاہکار کہنا ایسا ہی ہے جیسے فوج کے ہر سپاہی کو کپتان صاحب یا پولیس کے ہر سپاہی کو داروغہ جی یا ہندوستان کے ہر شاعر کو ڈاکٹر اقبال کہنا چغتائی کی تصویر بہترین سہی لیکن ہر ایک اس کا شاہکار نہیں ہو سکتی اور اگر اس کی تمام تصاویر شاہکار ہیں تو واقعی شاہکار معنی ہیں چغتائی کی تصویر کے اسی طرح ہم کو لفظ شاہکار سے چڑ نہیں ہے لیکن شاہکار کو ہم امتیازی شان پیدا کرنے والا سمجھتے تھے اور پنجاب کے رسائل نے اس کو عمومیت کی نشانی بنا دیا ہے کہ کسی کے مضمون کو برا نہ کہا مہذب الفاظ میں شاہکار کہہ دیا تو جناب جب آم گھاس سب شاہکار ہیں تو پنجاب کے مدیران رسالہ جات بخشیں، شوکت تھانوی کے مضامین کو شاہکار بنانے سے ہم کو اندیشہ ہے کہ تھوڑے دنوں میں یہ لفظ ایسے برے محل پر استعمال ہوگا کہ لوگ اس کو گالی سمجھا کریں گے۔

◆◆◆

سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کے تعبیر نیا خواب کے بعد ہم اندر جا کر سو گئے تھے اس لئے کہ آدھی رات کو اتفاقاً جاگ اٹھنے والا آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ کسی مسئلہ پر غور و فکر کر سکے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ آرام کرسی سے اٹھ کر جب پلنگ پر گئے تو ہم نے اپنا سر تکیہ پر اور پیر اونی چادر پر رکھے تھے ورنہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی نیند کا متوالا کسی وجہ سے آدھی رات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے تو وہ نہایت اطمینان کے ساتھ تکیہ پر پیر اور چادر پر سر رکھ کر خراٹے لینا شروع کر دیتا ہے، بہر حال ہم نے ذرا ہوش کا ثبوت دیا، انسانوں کی طرح لیٹ کر سو گئے، سونے کے بعد ہم نے وہ خواب تو نہیں دیکھا جس کا سلسلہ حقہ کی ”نے“ کے منہ پر گرنے سے منقطع ہو گیا تھا لیکن کچھ دیکھا ضرور جو بے ربط سا تھا مثلاً کبھی اپنے کو ہاتھی پر سوار دیکھا جو موٹر کی طرح تیز چلتا تھا اور پڑھے لکھے اردو دان کی طرح اپنی سونڈ کے نیچے والے منہ سے نہایت فصاحت اور بلاغت سے اردو بولتا تھا کبھی یہ دیکھا کہ ایک چیل ہم کو اپنے پنجوں میں دبا کر لے اڑی ہے اور ہم املی کے درخت سے الجھ کر اس کے پنجوں سے چھوٹ گئے ہیں، کبھی یہ دیکھا کہ ہم کو چند خوفناک صورت کے انسان اپنے حلقے میں لئے دانت نکال نکال کر ناچ رہے ہیں اور اپنے تیروں سے دھمکاتے جاتے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ اس ہیبت ناک رقص کے بعد ہم کو ماحضر بنا کر تناول فرمائیں گے مختصر یہ کہ اسی قسم کے مختلف اور بے ربط خوابوں کے بعد ہم نے نہیں معلوم کیا دیکھا کہ ایک دم سے اچھل کر بیدار ہو گئے، صبح ہو چکی تھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی لہذا ہم بھی ایک آدھ انگڑائی ایک آدھ کروٹ ایک آدھ جمائی کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

حالانکہ رات کا خواب ہمارے دماغ میں چکر لگا رہا تھا اور ہم اس خواب کو ایک حد تک صحیح بھی سمجھتے تھے لیکن معلوم نہیں کیوں ہمارا دل بار بار یہی چاہتا تھا کہ ہم اپنی بیکاری کو ختم کر کے کھدر میں لپٹے ہوئے میدان سیاست میں کود پڑیں اس دل چاہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم بیکار تھے دوسرے ہم کو یقین کامل تھا کہ ہم بغیر لیڈر بنے نہیں رہ سکتے اور اگر ہم کھدر پہننے کے بعد لیڈر بن گئے تو کیا کہنا ہے، اس سب رجسٹراری، اہلمدی، مویشی خانہ کی منشی گری وکیل کی دلالی، مونسپلٹی کی محرری، پولیس کی کانسٹیبلی، ریلوے کی ٹکٹ کلکٹری وغیرہ سے تو بہر حال اچھے ہی رہیں گے اور پھر لطف یہ ہے کہ ان سب عہدوں کے لئے باوجود پڑھے لکھے ہونے کے، بغیر تمام ہندوستان کے منسٹروں کی سفارش کے ہم قطعی نااہل ہیں۔ اگر ناک رگڑ کر مر بھی جائیں گے تو ہم کو ان جگہوں میں کوئی جگہ بھی بغیر اونچی اونچی

سفارشوں کے نہیں مل سکتی اور ان سفارشوں کا حاصل کرنا اس قدر دشوار ہے کہ اگر ہم اتنی ہی جدوجہد تخت افغانستان کے لئے کریں تو ممکن ہے کہ جلالتہ الملک شہریار غازی شاہ شوکت تھانوی خلد اللہ ملکہ و دولتہ ہو جائیں' یہ کیا کہ منسٹری لوکل سلف گورنمنٹ اور آنریبل ہوم ممبر وغیرہ کی تو سفارشیں حاصل کی جائیں اور جس جگہ کی سفارش حاصل کی گئی ہے اس کی تنخواہ پچیس روپے ماہوار ہے اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر ہم بی اے ہیں اور ہماری عمر بھی پچیس سال کے اندر ہے تو وہ جگہ ہم کو مل سکتی ہے ورنہ تمام جدوجہد بیکار' اب رہا لیڈر بننا اس کے لئے نہ کوئی عمر قید ہے نہ بارسوخ ہونے کی نہ اس میں ذات پوچھی جاتی ہے نہ برادری' بس سر سے لے کر پیر تک موٹے سے موٹے کھدر میں اپنے کو لپیٹے اور پیروں میں چپل پہننے کے بعد جس کا جی چاہے لیڈر بن سکتا ہے اور اس کے بعد ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق ترقی کر سکتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کی آواز بہت بڑی ہے اور وہ اپنے چہرہ میں جوش و خروش کے کیفیات پیدا کر دینے پر قادر ہے تو اس کا لیڈر نہ بننا سخت قسم کی حماقت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے چاروں طرف گھوم کر مختلف طریقوں سے اپنے ہاتھوں کو جنبش دے سکتا ہے تو وہ ایک کامیاب لیڈر ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت لیڈر بن جانا جیسا آسان ہے شاید کوئی دوسرا مشغلہ ایسا سہل نہیں ہے یہی وہ تمام آسانیاں تھیں جو سودیشی ریل کا خواب دیکھنے کے بعد بھی ہم کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور ہمارے واسطے اس میدان میں گنجائش بھی کافی تھی مثلاً یہ کہ ہم انگریزی اور اردو میں ہر مبحث پر اس سے جدا ہو کر نہایت مناسب تقریر کر سکتے تھے ہم غصہ کا ایکٹ اس طرح کر سکتے تھے کہ شاید کوئی انتہائی غصہ والا بھی نہیں کر سکتا۔ ہم کو اپنے ہاتھوں کے علاوہ انگلیوں کو مختلف طریقوں سے جنبش دینے میں مہارت حاصل تھی ہم اپنی آواز پر قادر تھے کہ جب چاہیں نہایت گرجتی ہوئی بنا دیں اور جب چاہیں نہایت نرم اور دھیمی کر دیں' یہاں تک کہ ہم آواز کو بھرائی ہوئی اور رومانی بنا دینے میں بھی مشاق تھے اب صرف ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم تقریر کے مخصوص الفاظ بیٹھ کر رٹ لیں اور یہ یاد کر لیں کہ کس لفظ پر ہماری انگلی کو کون سی جنبش ہونا چاہیے اور آواز کا کونسا سر ہو' یہ کوئی مشکل بات نہ تھی تین چار مقرروں کی تقریریں سن کر ہم سب کچھ سیکھ سکتے ہیں لہٰذا ہم نے کافی غور و فکر کے بعد طے کر لیا کہ خدا کا نام لے کر ہم کو لیڈر بن جانا چاہیے اللہ نے چاہا تو اس میں ایسی کامیابی ہوگی کہ یہ مہاتما گاندھی اور ''نہرویں'' وغیرہ سب منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ ایک دن ہم بھی کانگریس کے صدر ہو کر بتیس گھوڑوں کی گاڑی پر راجہ اندر بنے ہوئے نکلیں گے اس قسم کے خیالات سے ہمارے تمام جسم میں ایک سنسنی پھیل گئی ہماری آنکھیں خوشی کے مارے نکل آئیں اور ہمارا دل دھڑکنے لگا یہاں تک کہ مارے خوشی کے ہم اچھل پڑے اور طے کر لیا بس ہم کو جلد سے جلد لیڈر بن جانا چاہیئے' اب تک جو وقت بے کار گنوایا ہے وہی رونے کے لئے بہت کافی ہے۔ اگر پہلے سے ہم یہی کرتے تو اب تک کب کے مولانا رئیس الاحرار آقا' رفیق' شریمان' مہاتما وغیرہ

بن کر نہیں معلوم کیا بن گئے ہوتے۔

ارادہ پختہ ہو اور انسان مستقل مزاج تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی حاصل نہ ہو' جس شخص نے دنیا کی نشیب و فراز اس طرح طے کئے ہوں کہ گویا یہ ہزار وقت کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر چڑھے اور وہاں سے جو پیر پھسلتا ہے تو سب سے گہرے خندق میں نظر آتا ہے اور پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کرتا ہے اس سے پوچھئے وہ ترقی کا راز صرف مستقل مزاجی کو بتائے گا حالانکہ اسی مستقل مزاجی کے پیچھے خندقوں میں گرتے گرتے خود بدولت کی ہڈیاں چور چور ہو گئی ہوں گی لیکن اصول پھر بھی اصول ہے ہڈیوں کا چور ہونا ایک با اصول انسان کو بے اصول نہیں بنا سکتا' جس کو آبلہ پائی کی اذیت کم ہمت بنا چکی ہو وہ وادی پر خار میں قدم ہی کیوں رکھے گا حالانکہ آبلہ پائی کا علاج وہی خار مغیلاں ہیں جن کو دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے ہم جانتے تھے کہ ریشم کا سوٹ اتار کر ٹاٹ نما کھدر پہننے کے لئے ہم کو حقیقتہ ایثار کرنا پڑے گا۔ ڈاسن کے بوٹ کی جگہ چپل پہننا آسان کام نہیں ہے اور پھر اس وضع کو نباہ لے جانا تو اپنی قسم کا معجزہ ہوگا اور نباہ نہ ہو سکے تو دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے گویا جس بات کا ہم ارادہ کر رہے تھے اس پر تمام زندگی قاء رہنا شرط اولین تھی اور آپ جانتے ہیں کہ تمام زندگی کھدر پہن کر بسر کر دینے والا انسان معمولی قسم کے انسانوں سے ذرا مختلف ہوتا ہے لیکن جس وقت یہ خیال آتا تھا کہ اس نفس کشی کے بعد ہم کیا ہو جائیں گے اور ہم کو دنیا کیا سمجھے گی اس وقت ہم سب کچھ گوارا کر لینے کو تیار ہو جاتے تھے خود ہمارا ذہن ہم کو سبز باغ دکھانا شروع کرتا تھا کہ جب ہم برف کی طرح سفید کھدر میں ملبوس کسی جلسہ عام میں پہنچیں گے تو حاضرین سروقد کھڑے ہو کر ''اللہ واکبر'' اور ''بندے ماترم'' کے فلک شگاف نعروں سے ہمارا استقبال کریں گے جب ہم پلیٹ فارم پر جائیں گے تو ''مولانا شوکت تھانوی کی جے'' کے نعرے پنڈال کو لے اڑیں گے جب ہم تقریر کرنے کھڑے ہوں گے تو پھولوں کی بارش ہوگی اور ہم کو ہاروں میں چھپا دیا جائے گا ہم مسکرا کر دونوں ہاتھوں سے حاضرین کو سلام کریں گے اور حاضرین تالیاں بجا بجا کر ہم کو عزت پر عزت بخشیں گے ہم تقریر شروع کریں گے تو بار بار تالیاں بجائی جائیں گی اور ہماری جے کے نعرے بلند ہونگے' ہر طرف سے لوگ ہماری تصویریں لیں گے کسی تصویر میں ہم منہ کھولے ہوئے آ جائیں گے کسی میں منہ چڑاتے ہوئے کسی میں ہمارا ہاتھ اٹھا ہوا ہوگا۔ کسی میں رقص کناں ہوں گے وہی تصویریں تمام اخبارات میں شائع ہوں گی اور ہر طرف ہم ہی ہم ہوں گے' اب بتایئے کہ کیا یہ خیالات ایسے ہیں جن کے فریب سے انسان بچ سکتا ہے کم سے کم ہم سے تو یہ ممکن نہیں' چنانچہ ہم نے جلسوں میں پابندی کے ساتھ جانا شروع کر دیا تاکہ مختلف قسم کی تقریریں سن کر ہم اپنی تقریر کا طریقہ ایجاد کر سکیں گے۔ اس لئے کہ ہماری قسمت میں بھی لیڈر بننا لکھا ہوا تھا اور اگر نہیں لکھا ہوا تھا تو ہم خود لکھ رہے تھے' اس لئے کہ تقدیر ہماری ذاتی تھی۔

بھانت بھانت کی تقریریں سننے کے بعد اور مقرروں کی مختلف نقل و حرکت کی مشق کر کے ہم نے اپنی تقریر کا ایک معجون مرکب طریقہ ایجاد کیا اور اس طریقہ کی اپنا کمرہ بند کر کے دن رات مشق کی یہاں تک کہ ہم اپنے نزدیک موجودہ مقرروں میں سب سے بہتر مقرر ہو گئے ہمارے اہل محلہ کو تو ہمارے لیڈر بننے کی خبر ہو ہی گئی تھی اس لئے کہ جب ہم تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے تو سارے محلہ کے بچے اور بوڑھے ہمارے دروازہ پر جمع ہو جاتے اور جب تک ہم دروازہ کھول کر ''خیریت'' ہے نہیں کہہ دیتے سب لوگ جمع رہتے تھے کسی کو شبہ تھا کہ ہم کو کوئی دورہ اٹھتا ہے' کوئی اس خیال میں کہ ہم پر جنون کا سایہ ہے کوئی ہم کو مجنوں سمجھتا تھا اور کوئی مجذوب جانتا تھا لیکن ہم نے کبھی اس کی پروانہ کی اور اپنی دھن میں برابر تقریر کی مشق کرتے رہے جب ہم کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ اب ہم بالکل لیڈر بن سکتے ہیں تو ہم نے ایک ہنگامہ خیز تعارف کے ساتھ پبلک اور کانگریسی لیڈروں سے اپنے کو متعارف کرانا چاہا' اور اس کا طریقہ یہی مناسب سمجھا کہ ایک دن نہایت عمدہ ولائتی سوٹ پہن کر کسی عظیم الشان جلسہ میں جائیں اور وہاں ایک پر جوش تقریر کر کے ولائتی کپڑوں کی ہولی اور سودیشی کپڑوں کی بسم اللہ کر دیں بس اسی دن سے گویا ہم لیڈر ہو جائیں گے۔

تمام پروگرام مرتب ہو چکا تھا بس جلسہ ہونے کا انتظار تھا آخر وہ انتظار بھی ختم ہو گیا' اور ڈھنڈورا سن لیا کہ شام کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہو گا جس میں کسی بڑے لیڈر کی تقریر ہو گی' بس ہم نے اپنا وہی سوٹ پہنا اور دن بھر کمرہ بند کر کے تقریر کی مشق کی۔ شام کو جلسہ گاہ میں جا پہنچے جہاں ہم کو نہایت آسانی کے ساتھ پلیٹ فارم کے پاس ہی جگہ مل گئی اس لئے کہ اس وقت تک جلسہ میں سوائے دریاں اور چاندنیاں بچھانے والوں کے اور کوئی بھی نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ لوگ جمع ہونے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد خاصہ مجمع ہو گیا اور وہ لیڈر بھی ''اللہ اکبر'' اور ''بندے ماترم'' کے نعروں میں پلیٹ فارم پر تشریف لائے پہلے تو ایک کھدر پوش بزرگوار نے ان حضرت کا تعارف کرایا اور اس سلسلہ میں جو تقریر ارشاد فرمائی اس پر ہم دل ہی دل میں ہنسا کئے کہ یہ بھی کوئی تقریر میں تقریر ہے تقریر وہ ہو گی جس سے میں اس جلسہ کو زیروزبر کر دوں گا ان حضرت کی مختصر تقریر کے بعد ''چرخہ کا تو بیڑا پار ہے'' غلامی سے ہم کو بچائے گا کی قسم کی نظمیں پڑھی گئیں اور اس کے بعد وہ لیڈر صاحب کھڑے ہوئے ہر طرف پر جوش تالیاں بجائی گئیں' اور قومی نعرے بلند ہوئے' ہم ان تمام باتوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے گویا یہ سب کچھ ہمارے واسطے بھی ہو گا اور ہم نے اپنی جگہ طے کر لیا کہ ان حضرات کے بعد ہم تقریر کریں گے لہٰذا ہم نے ان کی تقریر بھی نہ سنی اور دل ہی دل میں اپنی تقریر دہرایا کئے یہاں تک کہ ان کی تقریر ختم ہو گئی اب جو ہم نے دیکھا تو ہمارے ہاتھ پیر سرد ہو گئے تھے اور کچھ ہاتھوں کی انگلیوں میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن ہم نے دل مضبوط کیا۔ تقریر کی اجازت مانگی جو فوراً مل گئی اور ہم سٹیج پر اس انداز سے پہنچے گویا تمام زندگی تقریر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے مجمع کو دیکھا تو

سب کی نظریں ہم پر اس طرح جمی ہوئی تھیں گویا ہم عجیب وغریب قسم کے جانور ہیں' ہم نے تقریر شروع کرنے کے ارادہ میں تقریباً دس منٹ گزار دیئے آخر آنکھیں بند کر کے کہنا شروع کیا۔

معزز خواتین! میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔ ہر طرف سے قہقہوں اور تالیوں کی صدا بلند ہوئی ہم اور اکڑ گئے لیکن جناب صدر کو رشک پیدا ہوا اور انہوں نے للکار کر ''خاموش'' کہا' کچھ لوگ چپ ہو گئے اور کچھ بدستور چیئرز دیتے رہے میں نے پھر کہا۔

معزز خواتین!۔۔۔۔۔۔ یہ کہنا تھا کہ پھر ایک طوفانی کیفیت پیدا ہوگئی اور اب کی مرتبہ ہم نے بھی محسوس کیا کہ اس ہنگامہ کی وجہ کیا تھی واقعی یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس جلسہ میں خواتین کہہ رہے تھے جہاں اتفاق سے کوئی خاتون نہ تھی لیکن جاہل حاضرین جلسہ کو اس کی خبر نہ تھی کہ تقریر کا یہ قاعدہ ہے کہ ''خواتین ضرور کہتے ہیں بلکہ یہ طریقہ تو انگریزی میں بھی رائج ہے کہ وہاں ''لیڈیز'' بالکل اس طرح کہا جاتا ہے گو بسم اللہ الرحمن الرحیم'' اس کے بعد تقریر شروع کی جاتی ہے' بہر حال ہم نے حاضرین کی جہالت پر دل ہی دل میں افسوس کرنے کے بعد کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''میں سب سے پہلے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مانچسٹر کہاں ہے؟ یہ ایک مقام ہے غالباً یورپ میں یا امریکہ میں' بہر حال ولایت میں اور اس میں ولایتی کپڑے اس طرح بنتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو آپ کے کھدر کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ آپ خود ان کا بنایا ہوا کپڑا پہنتے ہیں اور اسی کپڑے کو آپ کے مہاتما گاندھی اور میں سب لیڈر بدیشی کپڑا کہتے ہیں۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ میں بھی بدیشی کپڑا پہنے ہوں یہ سوٹ یعنی ٹائی کالر بلکہ کوٹ پتلون سب بدیشی ہیں یہ سوٹ بڑا قیمتی ہے اور پتلون کا کپڑا میں نے سولہ روپے پانچ آنے گز خریدا تھا اور پھر سلائی دی یعنی انگریزی کارخانہ کی سلائی جو کپڑے سے زیادہ تھی جب میں نے اس سوٹ کی تیاری کے بعد میزان کل کا خانہ بھرا ہے تو تقریباً سو روپیہ ہوتے تھے لیکن آج میں یہ بیش قیمت سوٹ ملک وقوم کے لئے ہندوستان کی بھارت ماتا کے لئے آپ حضرات کے لئے سب کے سامنے جلاتا ہوں آپ لوگ مجھ کو دیکھ کر سبق حاصل کریں میں آج اپنی قوم کی خاطر لیڈر بننے کے لئے میدان میں آ گیا ہوں (قہقہہ) اب میں اپنی جان پر کھیل کر لیڈر بن رہا ہوں' آپ حضرات اگر مجھ کو کانگریس کا صدر بنا دیں تو میں بھارت ماتا کے سپوتوں کے خون سے بھارت ورش کو سینچ کر دکھا دوں گا (قہقہہ) مادر ہند کے سعادت مند بیٹوں کی طرح آپ کا فرض ہے کہ آپ جس طرح بھی ہو سکے جیل جائیں اور سزا یافتگی کا تمغہ حاصل کر کے (قہقہہ قہقہہ قہقہہ کرسی صدارت سے خاموش' حضرات خاموش کی پے در پے صدا اور مجھ سے بیٹھ جانے کی استدعا' لیکن میں جوش میں تھا میں نے پھر مٹھی باندھ کر کہنا

شروع کیا۔

حضرات! دیکھئے آپ کو چاہیے کہ آپ جھوٹ نہ بولا کریں، نماز پڑھا کریں، بڑوں کا ادب کریں، ورزش کریں، ہلکی غذائیں کھائیں اور جلد اٹھا کریں، اپنے لڑکوں کو سکول نہ بھیجیں ورنہ وہ بدیشی ہو جائیں گے، میری یہ نصیحتیں یاد رکھئے وقت پر کام آئیں گی۔

آمادہ بہ قتل من آں شوخ ستمگارے
ایں طرفہ تماشا ہیں ناکردہ گنہگارے

میں اپنی تقریر کے بعد رومال سے پسینہ پونچھتا ہوا پلیٹ فارم سے نیچے اتر آیا مجمع نے پرجوش چیرز دیئے، بلکہ سیٹیاں بھی بجائیں اور ایک آدھ مرتبہ "ونس مور" بھی کہا میں اپنی کامیابی پر خوش تھا، مگر میرے مزاج میں ہمیشہ سے انکسار ہے لہذ گردن نیچی کئے بیٹھا رہا۔ جلسے کے بعد کثیر التعداد لوگوں نے مجھ کو حلقہ میں لے لیا جس میں سکول کے طالب علم بہت تھے سب میرے نیک مشوروں سے خوش تھے اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے بچپن میں اپنا سوٹ اتار کر کھدر پہن چکا تھا اور اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر معلوم ہو رہا تھا، میرا سوٹ میری نظروں کے سامنے جلانے کے لئے رکھا گیا اور آگ لگا دی، میں مردانہ وار اس منظر کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ دھواں ہونے کے بعد دفعتاً ایک آگ بھڑک اٹھی، اس وقت مجھ سے نہ دیکھا گیا میں نے اپنی نظریں پھیر لیں، لیکن زبان سے اف بھی نہ کی، لوگ مجھ پر گرے پڑتے تھے اور میں پسا جاتا تھا لیکن اس احساس سے خوش تھا کہ یہ لوگ اپنے جذبہ عقیدت مندی سے مغلوب ہو کر سب کچھ کر رہے ہیں مجھ کو اس قسم کی خوشی یا تو اپنی شادی میں ہوئی تھی جب میں دولہا بنا ہوا بارات میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا یا آج مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں بس میں ہی ہوں، لوگ مجمع کو ہٹاتے ہوئے مجھ تک آتے تھے کوئی تو میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تھا کہ مولانا اس کو اور بڑھا لیجئے، میں اسی شان لیڈری میں جواب دیتا تھا۔ "انشاء اللہ بھائی انشاء اللہ" کوئی میری تقریر کی تعریف کرتا کہ "سبحان اللہ کیا مسلسل تقریر فرمائی ہے"، اور میں مسکرا کر شکریہ ادا کرتا کوئی مجھ کو نہایت ادب سے سلام کرتا تھا جس کا جواب میں گردن کی جنبش سے دیتا تھا، اس لئے کہ دونوں ہاتھ تو مصافحہ میں مصروف تھے، مختصر یہ کہ مجمع تمام وہ حرکتیں کر رہا تھا جو عقیدت مندوں کو کرنا چاہیے اور میرا طرز عمل بالکل لیڈرانہ تھا، میں اسی مجمع میں گھرا ہوا آگے کی طرف کھسک رہا تھا اور میرے ساتھ ساتھ مجمع بھی آگے بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ میں جلسہ گاہ سے نکل کر اس شمع کی طرح سڑک پر آ گیا جس کے چاروں طرف برسات کے زمانہ میں پروانوں کا ہجوم ہو، میرے ایک دیرینہ کرم فرما نے میری شان اور بھی بڑھا دی کہ اپنا موٹر لے کر میری طرف بڑھے اور مجھ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا میں "لینا ہے، لینا ہے" کے پرجوش قومی نعروں کے درمیان موٹر پر نہایت تیزی کے ساتھ مجمع سے نکل گیا۔

اس کامیابی نے قدرتی طور پر مجھ میں ایک غرور پیدا کر دیا تھا مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ میں عام سطح سے بلند انسان ہوں بلکہ مجھ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا تمام ہندوستان میرے سامنے جھکا ہوا ہے اور میں اپنے ہاتھ سے جھکے ہوئے سروں کو اٹھا رہا ہوں مجھ کو یقین تھا اور کامل یقین تھا کہ اگر مہاتما گاندھی میرے مشوروں پر چلے تو ہندوستان غلام نہیں رہ سکتا' مہاتما گاندھی کو میرے مشوروں پر چلنا پڑے گا اور وہ بغیر میرے کچھ نہیں کر سکتے آج کی تقریر کے بعد میرے پوجاریوں کی تعداد ان کے پوجاریوں سے کہیں بڑھ گئی ہے اگر آج میں اس مجمع سے کہہ دیتا کہ سوراج لے لو' تو یہ لوگ یقیناً لے لیتے' لیکن میری مصلحت یہی تھی کہ جناب گاندھی صاحب مجھ سے میری مدد مانگیں اور میں ان سے کہوں کہ ’’پہلے ہار مان لو اور کہہ دو کہ میری مہاتمائیت سے کچھ نہ ہو سکا اب آپ میری مدد کیجئے‘‘ پھر تو میں ایک اشارہ میں سوراج دلوا دوں گا' میں اپنے انہی خیالات میں محو تھا کہ میرے موٹر والے دوست نے کہا۔

’’یہ تم نے کیا کیا؟‘‘

میں: ’’آفتاب بادلوں میں زیادہ عرصہ تک چھپا نہیں رہتا‘‘

دوست: ’’یعنی؟‘‘

میں: ’’یعنی کیا؟ جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھ ہی لیا تم کو فخر کرنا چاہیے کہ میں تمہارے موٹر پر بیٹھا ہوں اور تمہارا دوست ہوں۔‘‘

دوست: ’’مجھ کو تو شرم آتی ہے۔‘‘

میں: ’’خیر تم تو مذاق کرتے ہو مگر تم نے دیکھ لیا کہ میں کس مرتبہ کا انسان ہوں۔‘‘

دوست: ’’ہاں مجھ کو یہ امید نہ تھی کہ تم۔‘‘

میں: ’’بات یہ ہے کہ میں خاموش بہت رہتا تھا نا؟‘‘

دوست: ’’نہیں میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تم کو اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔‘‘

میں: ’’کیا کہا' بیوقوف؟‘‘

دوست: ’’یہ میری رائے نہیں' اس مجمع کی رائے ہے جس کو بنا بنایا بیوقوف مل گیا۔‘‘

میں: ’’کیا بکتے ہو؟ ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا' سچ بتاؤ کہ میری تقریر کیسی تھی؟ لوگ تھرا گئے ہوں گے؟‘‘

دوست: ’’سب ہنس رہے تھے کہ یہ عجیب قسم کا جانور ہے۔‘‘

’’میں‘‘ پھر وہی مذاق' ایمان سے کہو تم نے ایسی تقریر سنی ہے کبھی؟‘‘

دوست: ''اس میں تو شک نہیں کہ یہ آج پہلا اتفاق ہے لیکن اگر میں تم کو نہ لے بھاگتا تو لوگ نہ معلوم کیا گت بناتے۔''

میں: ''خیر وہ بیچارے اپنے جذبات سے مجبور تھے ان کا دل چاہتا تھا کہ میرے قدموں کے نیچے کی خاک بن جائیں۔''

دوست: ''مجھ کو تم سے ایسی امید نہ تھی کہ تم اس قدر بے حس ثابت ہو گے تم کو اتنا احساس بھی نہ ہوا کہ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں تم کو بیوقوف بنایا گیا تمہارا مذاق اڑایا گیا اور تم برابر حماقت پر حماقت کرتے رہے، میں حیران ہوں کہ آخر تم کو سوجھی کیا تھی؟ اور اب تک تمہارا دماغ صحیح نہیں ہوا ہے''

میں: ''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

دوست: ''مطلب یہ ہے کہ تم نے جس مضحکہ خیزی کا ثبوت دیا ہے وہ تمسخر کی حد سے گزر کر قابل افسوس بن گیا۔''

میں: ''یعنی قوم کے لئے ایثار کرنا مضحکہ خیزی ہے تم بڑے نادان ہو، جاہل ہو اخبار پڑھا کرو۔''

دوست: ''قوم کے لئے ایثار اس طرح ہوتا ہے کہ انسان جوکر بن جائے، آپ نے تقریر فرمائی ہے کہ کامک کا پارٹ کیا ہے۔''

میں: ''تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اگر ہندوستان میں تمہارے ایسے جاہل لوگ نہ ہوتے تو یہ مصیبت نہ ہوتی۔''

میرے گھر کے قریب موٹر ٹھہر گیا اور میں اپنے دوست سے رخصت ہو کر گھر پہنچا، جہاں پہلے سے میرے دوستوں کا مجمع مجھے مبارک باد دینے کے لئے موجود تھا، میرے پہنچتے ہی سب کھڑے ہو گئے میں سلام کرتا ہوا اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے بعد میرے سب دوست بھی بیٹھ گئے اس میں شک نہیں کہ آج میرا مرتبہ بہت بلند تھا، لیکن بے تکلف دوستوں سے خدا بچائے یہ لوگ بلند وپست سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں ان کے نزدیک میں اب بھی تھرڈ کلاس کا انسان تھا ایک صاحب کہنے لگے۔

''مہاتما جی، رئیس الاحرار، شریمتی مولانا کیا کیا کہوں میں آپ کو۔''

میں: ''ان سب میں فرق ہے، مہاتما جی اول تو مہاتما گاندھی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ دوسرے میں مسلمان ہوں رئیس الاحرار آپ کہہ سکتے ہیں اور شریمتی تو عورتوں کے لئے ہے، مولانا بھی کہا جا سکتا ہے۔''

دوسرے صاحب: ''مگر تقریر تو ایسی تھی کہ آپ کو جو کچھ نہ کہا جائے کم ہے۔''

میں: ''مجھے خود حیرت ہے کہ امید سے زیادہ کامیاب رہی۔''

تیسرے صاحب: ''یعنی آپ خوش بھی ہو رہے ہیں''

میں: ''خوشی کی بات نہیں، میں تو اس اتفاقی کامیابی کو کہتا ہوں۔''

چوتھے صاحب: ''یہ لوگ تمہارا دماغ خراب کردیں گے اور سڑی پن میں جو کمی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی آج آخر تم پر یہ کیا مار پڑی تھی کہ ہزاروں آدمیوں میں اپنی ہنسی اڑوائی۔''

میں: ''ہنسی اڑوائی کیا معنی؟''

وہ: ''ہاں تم سے کس نے کہا تھا کہ تقریر کرو اور حماقت آبی کا ثبوت دو''

میں: ''کیا تقریر بری تھی کچھ؟''

وہ: ''جی نہیں بہت اچھی تھی مگر خدا کے واسطے اب حماقت نہ فرمایئے گا۔''

میں: ''یعنی خواہ مخواہ''

وہ: ''ارے حماقت کے پوٹ سب نے تجھ کو تماشا سمجھا تھا۔''

میں: ''کس قدر تالیاں بجائی گئیں، کس قدر لوگوں میں جوش پیدا ہوا کس قدر نعرے بلند کئے گئے اور تم کہتے ہو یہ نہیں وہ۔''

وہ: ''یہی سب کچھ ایک پاگل کے ساتھ ہوتا ہے جس کو آپ اپنی تعریف سمجھ رہے ہیں وہاں آپ بنائے جا رہے تھے تمام مجمع آپ پر ہنس رہا تھا اور آپ تھے کہ خبطی کی طرح اپنی دھن میں مست تھے دل تو چاہتا تھا کہ اسی بھرے ہوئے جلسہ میں سٹیج پر جا کر تمہارا منہ بند کردوں کیا کروں مجبور تھا معلوم نہیں کس طرح اب تک ضبط کیا اور تم ہو کہ اب تک تم کو ہوش نہیں آیا ہے۔''

میں: ''یعنی بکے جا رہے ہو آخر ہوا کیا میں نے کون سی ایسی برائی کی ہے جس پر آپ کا.......''

وہ: ''میرا کیا نقصان ہے میں تو تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں ایک آدھ اسی قسم کی تقریر کرنے کے بعد تم خود دیکھ لینا کہ تم کو پاگل خانے بھیجنے کی فکر ہونے لگے گا واللہ آج تم نے حد کردی۔''

میرے سب دوستوں نے ایک زبان ہو کر مجھ کو کچھ اس طرح برا بھلا کہا کہ اب مجھ کو بھی اپنے پاگل ہونے کا یقین ہونے لگا وہ لوگ تو لعنت ملامت کی بوچھار میں مصروف تھے اور یہاں میری دماغی کیفیت یہ تھی کہ کبھی تو کھدر کے کرتہ کا گریبان تار تار کرنا چاہتا تھا کبھی ان سب دوستوں کو مار کر بھاگ جانے کا ارادہ کرتا تھا کبھی دل چاہتا تھا کہ اس زور سے چیخنا شروع کروں کہ ان سب کی زبان از خود بند ہو جائے کبھی رونے کی ٹھہراتا تھا اور کبھی گانے کی، لیکن پھر میرا دل کہتا تھا کہ نہیں یہ لوگ حاسد ہیں میری کامیابی نہیں دیکھ سکتے، آج مجھ کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے اس کو دیکھ کر ان سب کے کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں انہی کی طرح جاہل کندہ ناتراش بنا رہوں اور اسی طرح اپنی قیمتی زندگی کو برباد کروں، آج میری ذات سے ملک و قوم کو کیسی کیسی امیدیں ہیں اگر میں ان

جاہلوں کے کہنے میں آ گیا تو قوم کی رہنمائی کون کرے گا' میں لیڈر ہوں میرا فرض ہے کہ اپنے ملک کی رہنمائی کے لئے ہر طرح کی مخالفت کا مقابلہ کروں' یہ تو دوستوں کی مخالفت ہے۔ مجھ کو تو ابھی تمام دنیا کی مخالفت کا مقابلہ کرنا ہے۔ گورنمنٹ کی مخالفت کروں گا۔ مگر گورنمنٹ کی مخالفت میں جیل جانا پڑے گا اور جیل میں چکی پیسنا پڑے گی' اول تو خدا وہ وقت نہ لائے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا بھی تو میں ہندوستان کا واحد لیڈر بن جاؤں گا میری جے کے نعرے بلند ہوں گے' میرا نام لے کر میری قوم کا ایک ایک فرد اٹھا اور بیٹھا کرے گا اور اگر سوراج مل گئی یا مل گیا تو میں ہی ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جاؤں گا اس وقت میں ان نادان دوستوں سے پوچھوں گا کہ اب کیا کہتے ہو اس وقت تو ان کے منہ لگنا اپنی بات کھونا ہے اس وقت ان کا جو جی چاہے کہہ لیں۔

میرے دوست مجھ کو خاموش دیکھ کر سمجھے کہ شاید ان کی نصیحت کا میں اثر قبول کر رہا ہوں' چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا۔

''اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ کیا حماقت سرزد ہوئی؟''

دوسرے: ''اب بھی سمجھ میں آ جائے تو غنیمت ہے' ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔''

تیسرے: ''انسان سے غلطی ہوتی ہے اس بیچارے سے بھی چوک ہو گئی۔''

چوتھے: ''نہیں ان کو اگر ملکی کاموں میں حصہ لینا ہے قوم کی خدمت انجام دینا ہے تو اس کا یہی طریقہ تو ہے نہیں کہ بس تقریر کر دی اور لوگوں کو اپنے اوپر ہنسوا لیا اور سینکڑوں ٹھوس کام ہیں' مثلاً یہ کانگریس کے رضا کاروں میں بھرتی ہو جائیں' نمک بنائیں اور اس سلسلہ میں جیل جائیں بہرحال یہ ایک کام ہوگا لیکن یہ تقریر کا تو کوئی تک ہی نہیں ہے۔ جب ایک بات آپ کو نہیں آتی تو آپ اس کو اختیار ہی کیوں کرتے ہیں۔''

میں نے ان لوگوں کی باتوں کو تو ہاں ہوں کر کے ٹال دیا کہ کسی طرح جان بچے' لیکن دل تو یہ چاہتا تھا کہ ان جاہلوں کو اپنے مکان سے کان پکڑ کر نکلوا دوں بدتمیز کہیں کے کہتے ہیں کہ رضا کاروں میں بھرتی ہو جاؤ' ان نالائقوں سے کوئی پوچھے کہ مہاتما گاندھی رضا کاروں میں بھرتی ہوئے تھے/ کیا پنڈت موتی لال نہرو شروع ہی سے لیڈر نہیں ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لیڈر نہ بنیں اور رضا کار بن جائیں اور پھر کہتے ہیں یہ لوگ کہ نمک بناؤ اگر ہم کو کچھ بنانا ہی ہے تو شکر کیوں نہ بنائیں' ملائی کی برف کیوں نہ بنائیں' آم کا اچار کیوں نہ بنائیں؟ بنائیں بھی تو کیا نمک؟ سبحان اللہ جس کا بنانا اور نہ بنانا سب یکساں ہے مگر یہ بیچارے مجبور ہیں ان کا تخیل بس نمک تک ہی پرواز کر سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشورے دینے والوں کی کسی بات پر عمل کرنا کس قدر خطرناک ہے' یہ لوگ بھی جاہل ہیں اور بیوقوف بھی ان کی باتوں پر تو بس ہنس دینا چاہیے۔

میرے دوست رخصت ہو چکے تھے اومیں تنہا بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا تھا سونے کا ابھی وقت نہ تھا لہٰذا بازار کی سیر سب سے مناسب معلوم ہوئی اومیں گھر سے نکل کر بازار کی طرف چل دیا پہلے تو میں خود اپنے کو عجیب وغریب معلوم ہوا' بات یہ ہے کہ نہ چپل کی عادت تھی نہ لمبے کرتے کی' معلوم ہو رہا تھا کہ غسل خانہ سے نکل کر سڑک پر آ گیا ہوں' خود میرا کتا مجھ کو دیکھ کر بھونک چکا تھا لیکن وہ تو پھر بھی جانور تھا راستے میں جتنے انسان ملے سب نے مجھ کو اس طرح دیکھا گویا میں کوئی غیر جنس ہوں جس کو دیکھئے میری طرف انگلی اٹھا کر کچھ کہتا تھا اور ہنستا تھا میں اس انگشت نمائی کے معنی سوائے اس کے اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگ میری زندگی کے اس انقلاب پر متحیر تھے' راستہ میں ایک آدھ شخص نے مجھ کو ہنس کر سلام کیا اور میں نے جواب دیا لیکن جب بازار میں مجھ کو دیکھ کر لوگوں نے واقعی تماشا بنا لیا اور ہر طرف سے میری جانب انگلیاں اٹھنے لگیں تو میں خود گھبرا کر ایک گلی میں گھس گیا' کچھ لوگ میرے پیچھے دوڑے اور مجھ کو گلی میں آ کر گھیر لیا' میں نے زبردستی اپنے کو سنجیدہ بنا کر کہا۔

''آپ حضرات کیا چاہتے ہیں؟''

سب یک زباں ہو کر: آپ ہمارے رہنما ہیں آپ ہمارے لیڈر ہیں' ہم تو آپ کے مشورے سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

میں: ''لیکن یہ کونسا وقت ہے۔''

وہ لوگ: ''آپ کی تقریر سے سیری نہیں ہوئی ہم کچھ اور سننا چاہتے ہیں۔''

میں: ''تو پھر کبھی سہی' بہر حال اب تو وقت نہیں ہے۔''

تیسرا: ''چھوڑ دو' بیچارے کو جانے دو۔''

چوتھا: ''اجی لیڈر صاحب آپ تو تقریر کیجئے''

میں: ''اچھا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔

سب تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ گئے اور میں بھی تھوڑا سا ان سے پیچھے ہٹا میں نے اپنی چپلیں اتار کر ہاتھ میں لیں اور کہنا شروع کیا۔

''بھائیو! میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس وقت اپنے گھروں میں جا کر سو رہیے۔ اور مجھ کو بھی جانے دیجئے۔ اس وقت ملک وقوم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی''

سب نے یک زبان ہو کر چیخنا شروع کیا۔ ''نہیں تقریر' نہیں تقریر''

میں نے پھر ہاتھ اٹھا کر خاموش کیا اور کہنا شروع کیا۔

''آپ میرے مشورے پر عمل کیجئے' ورنہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں قوم کی خدمت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیے پھر کبھی تقریر ہوگی اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔''

یہ کہہ کر میں نہایت تیزی سے بھاگا اور تمام مجمع میرے پیچھے دوڑا' میں نے اپنے گھر میں گھس کر زنجیر چڑھا دی' آخر کار سب لوگ لوٹ گئے۔ اس روز رات پھر مجھ کو نیند نہ آئی اور صبح یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بھی سودیشی ریل کی طرح کا کوئی خواب پریشان ہوگا لیکن میرے جسم پر کھدر کا لباس موجود تھا' لہٰذا یہ واقعات خواب نہیں ہو سکتے ہاں یہ ممکن ہے کہ میں نے بیداری میں یہ خواب دیکھا ہو یا یہ واقعات سودیشی ریل کے خواب کی تعبیر تھے۔

◆◆◆

نسیم انہونوی

آپ کا اسم گرامی محمد نسیم ہے اور اگر عاشقی میں عزت سادات نہیں گئی ہے یعنی میر تقی میر کی طرح آپ بھی خوار ہوتے نہیں پھرے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ آپ کو بھی کوئی نو پوچھے تو آپ سید بھی ہیں' ضلع رائے بریلی کے قصبہ انہونہ کے رہنے والے ہیں لہٰذا آپ کا نام مکمل سید محمد نسیم انہونوی ہے لیکن آپ اپنے کو یا تو انکسار سے یا دنیا کو تخلص کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے صرف نسیم انہونوی لکھتے ہیں۔ حالانکہ خدا گواہ ہے کہ آپ اور چاہے جو کچھ بھی ہوں لیکن شاعر نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود ہم نے ان حضرت کو ایک ادھ گھریلو مشاعرہ میں اپنی ذاتی غزل پڑھتے سنا ہے' لیکن اس کے باوجود ہم کو بھی یقین نہیں آیا کہ آپ شاعر بھی ہوسکتے ہیں رہ گئی وہ غزل جو ہم نے آپ کو پڑھتے سنی ہے اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا جانے وہ کم بخت اپنی قسمت سے نسیم انہونوی کا نتیجہ فکر کیوں کر بن گئی کاش کہ وہ کسی شاعر کی غزل ہوتی۔ مختصر یہ کہ آپ صاحب دیوان تو نہیں البتہ صاحب اولاد ہیں اور چونکہ صاحب اولاد ہیں لہٰذا ظاہر ہے کہ کسی اللہ کی بندی کے شوہر نامدار بھی ہوں گے بہر حال ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ نسیم انہونوی ایسے انسان کا صاحب اولاد ہونا یا صاحب جائیداد ہونا کسی کا شوہر بن جانا یا کسی کو بیوی بنالینا سب یکساں ہے اور ان کو مختلف باتوں میں کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوسکتا' بلکہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ ”آپ نے شادی کیوں کی؟“ تو وہ یقیناً یہی جواب دیں گے کہ ”ہوگئی ہوگی میں نے تو نہیں کی“ اور اسی طرح اولاد والے سوال کا جواب بھی ہوگا' ان جوابات میں کسی قسم کا کوئی مزاح' کوئی تصنع یا کوئی غلط بیانی قطعاً نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے ان سے متعلق جتنی دنیا کی باتیں ہوتی ہیں وہ عام طور پر خود بخود ہوجایا کرتی ہیں ان میں خود نسیم صاحب کے ارادہ یا عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور اگر عمل کو دخل ہوتا بھی ہے تو قطعاً غیر ارادی طور پر' لیکن اس کے باوجود آپ اپنے متعلقہ کاموں میں انہماک اور محنت کے اعتبار سے اپنی قسم کے کولہو کے بیل واقع ہوئے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان ایسے انسان کی بھی دنیا کو ضرورت ہے اور ان کو بھی غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا خصوصیت کے ساتھ ان کا وہ استقلال جس کو ہم اور ہماری قسم کے سیمابی ارادوں والے انسان جنکی فطرت ہی میں غیر مستقل مزاجی ہے بے حسی کہنے میں یقیناً قابل داد ہے۔

نسیم صاحب کا بچپن اور وہ دور جس میں انسان اور غلمان میں بہت کم فرق ہوتا ہے ہمارے لئے قطعاً تاریکی میں ہے اور ہم اس پر کوئی روشنی اس لئے نہیں ڈال سکتے کہ نسیم صاحب سے اس زمانہ میں شرف نیاز حاصل نہ تھا ہم تو ان کو اس وقت سے جانتے ہیں جب

’’ہمدم‘‘ مرحوم کے جالبی دور کے بعد ہم ایک رکن ادارت کی حیثیت سے دفتر روزنامہ ’’ہمدم‘‘ میں دن بھر بیٹھ کر کام کرتے تھے اور نسیم صاحب انہونوی رسالہ ’’انکشاف‘‘ کے مدیر کی حیثیت سے روزانہ ہمارے پاس صرف اس لئے آتے ہیں کہ ہم انکشاف کے سالانہ نمبر کے لئے ایک افسانہ لکھ دیں‘ ہم روز دوسرے دن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ہمارے لئے یہ رائے قائم کر رہے تھے کہ ہم سخت جھوٹے ہیں اور ہم ان کے لئے یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ انتہائی مستقل مزاج شخص ہے لیکن وہ ہماری وعدہ خلافیوں کو شکست دینے کے درپے تھے اور ہم ان کی مستقل مزاجی کے مسلسل اور متواتر امتحان لے رہے تھے‘ خدا جانے اس سلسلہ نے کہاں تک طول کھینچا‘ لیکن ہم کو تو اتنا یاد ہے کہ ہم ہی کو شکست ہوئی تھی اور انکشاف کے سالانہ نمبر میں نہ صرف ہمارا افسانہ شائع ہوا تھا بلکہ افسانہ بھی‘ نظم بھی اور تصویر بھی مختصر یہ کہ ہمارے اور ان کے تعلقات کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔

شروع شروع میں تو ہم نے یہ رائے قائم کی تھی کہ بیچارہ نسیم فدوی قسم کا انسان ہے اور بیچارہ ’’نسیم انہونوی‘‘ نہیں بلکہ نسیم نہونوی‘ ہے اور واقعی ان کا جو فدویانہ اور خاکسارانہ طرز عمل ہمارے ساتھ تھا اس سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے تھے کہ ان ہمچداں صاحب کا عدم اور وجود سب برابر ہے یہ تو بس سعادت آثار ہی سعادت آثار ہیں لیکن رفتہ رفتہ جب آپ کے نوعروسانہ حجاب نے بے حجابی کی صورت اختیار کی اور آپ ذرا کھلے تو معلوم ہوا کہ آپ میں فدویت تو نہیں ہے‘ البتہ نسائی جھجک ضرور ہے‘ یہ خصوصیت ایسی نہ تھی جس کو ہم گنواروں کی طرح غیر محسوس طور پر نظر انداز کر دیتے‘ ہم نے اس کی دل سے قدر کی اور ہم کو اس کا افسوس بھی ہوا کہ یہ قیمتی صفات فطرت کی ذرا غلطی سے بجائے کسی کافرہ کو ملنے کے اس کافر کو مل گئے اگر کہیں یہ لجایا ہوا تبسم یہ شرگیں نگاہیں‘ یہ دامن بچانے والی ادائیں یہ آواز کا ترنم‘ یہ رفتار کی غزالیت‘ یہ پیروں سے اوپر تک والی طاؤسیت‘ یہ لچک‘ یہ چمک‘ یہ جھجک‘ یہ کسک اور یہ مسک کسی عورت کو مل جاتی تو ہم سچ کہتے ہیں کہ وہ قیامت بن کر دنیا کو ہلا ڈالتی لیکن فطرت کی غلط بخشیوں نے ان عطایا کے لئے ایک مرد کا انتخاب کیا اور وہ بھی نسیم انہونوی ایسے مرد کا پھر بھی ہم کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ باوجود نسیم صاحب کے مرد ہونے کے ان خصوصیات کے قدردانوں کی تعداد کم نہیں ہے اور ایسے ایسے حسن شناسوں نے ان چیزوں کی تعریف کی ہے جن کی تعریف ہر حیثیت سے معتبر کہی جا سکتی ہے چنانچہ مجھ کو مولانا سیماب صدیقی اکبرآبادی کا یہ فقرہ کبھی بھی نہیں بھول سکتا کہ نسیم کی چال میں کافی پامالیوں کے سامان موجود ہیں‘ یا جناب وصل بلگرامی نے آپ کی سرگیں آنکھوں کی موہنی کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے چاہے دنیا جتنی بھی بدگمان ہو لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ انہوں نے بے اختیار ہو کر نسیم کے منہ پر نہ کہنے والی بات کہہ دی‘ خیر ان تمام باتوں کے متعلق تو نسیم صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ احباب کا مذاق ہے لیکن ان کے پاس اپنے والدین کے اس مستقل مذاق کا کیا علاج ہے جو انہوں نے آپ کا زنانہ نام

رکھنے کے معاملہ میں کیا ہے کیا اس سے بھی وہ مکر جائیں گے کہ ان کا نام نسیم ہے اس کو جانے دیجئے لیکن خود ان حضرت نے ایک زنانہ رسالہ ''حریم'' کے نام سے نکال کر اپنی نسائیت کا جو عملی ثبوت دیا ہے اس کا کیا علاج ہے؟

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نسیم نے مرد ہو کر جو ظلم کیا ہے اس کے لئے ہم تو یقیناً خدا کے یہاں ان کے دامن گیر ہوں گے اس لئے نہیں کہ وہ حسین ہیں اور نہ اس لئے کہ ہم پر ان کی جاذبیت کا کوئی اثر ہوا ہے' بلکہ محض اس لئے کہ ہم کو ان سے محبت ہے اور یہ محبت انتہائی مدارج طے کرنے کے بعد بھی دوست کی محبت رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی ہم پھر ایک مرتبہ اس بات کو صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری محبت کا کوئی تعلق نسیم کی لطافت یا ان کے نام کی نزاکت سے نہیں ہے بلکہ ہم کو تو وہ یوں ہی اچھے لگتے ہیں ان کی بھولی بھالی باتیں' ان کی سادہ سادہ ادائیں' ان کے دل اور زبان کی یکسانیت' ان کی بچوں کی سی معصومیت ان کی سادہ لوحی' ان کی سچائی' ان کی دیانت داری' ان کی ''یک تختی'' والی افتاد طبیعت اور ان کی اسی قسم کی باتیں ان کو حلقہ احباب میں محبوب ترین رکن بنا دینے کے لئے کافی ہیں' بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے یاران میکدہ میں یا بقول مولانا نیاز فتح پوری یاران نجد میں نسیم صاحب کو وہی درجہ حاصل ہے جو بارات میں دولہا کو' کانگریس کے اجلاس میں صدر منتخب کو' افیونیوں کی مجلس میں داستان گو کو' میخانہ میں پیر میخانہ کو' گورنر اجلاس کونسل میں گورنر کو' ریل گاڑی میں انجن کو' امین آباد پارک میں گھنٹہ گھر کو' آگرہ میں تاج محل کو' دہلی میں جامع مسجد کو' مہوبہ میں پان کو' لکھنو میں چکن اور جامدانی کو' ڈھاکہ میں ململ کو' ہاپوڑ میں پاپڑ کو' ملیح آباد میں سفیدہ اور دسہری آم کو' ہاتھرس میں سروتے کو' کشمیر میں آلوچے کو اور الہ آباد میں امرود کو حاصل ہے۔ ان سینکڑوں مثالوں کے بعد نسیم صاحب کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے' صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ

اف یہ تیری انجمن آرائیاں

نسیم فطرتاً کچھ ایسے نیک واقع ہوئے ہیں کہ ان سے دلچسپی لینے کو دل چاہتا ہے ان کی معصوم باتیں بعض اوقات اس قدر پر لطف ہوتی ہیں کہ ان کو چھیڑ چھیڑ کر لطف حاصل کرنے ہی میں دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں' مثلاً چھیڑ دیجئے کوئی مذہبی مسئلہ پھر دیکھئے کہ کیسا چہکتے ہیں' اپنے نزدیک ایسے ایسے دلائل سے بحث کریں گے کہ اگر اللہ میاں بھی ان کو رد کرنا چاہیں تو آسانی کے ساتھ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ویسے تو وہ پھر اللہ میاں ہی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ نہ خود قائل ہوں گے نہ دوسرے کو قائل کریں گے' بس ان کی صرف یہ کوشش ہو گی کہ بحث کسی طرح طویل ہو جائے اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر کبھی ختم نہ ہو اسی طرح بزنس کے معاملات پر جس وقت تبصرہ کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہو گا تجارت کے وہ تمام اصول جن پر آج دنیا کے بڑے بڑے تجارتی ممالک عمل کر رہے ہیں دراصل آپ ہی کے مقرر کردہ ہیں اور آپ کو کسی قسم کا تجارتی مشورہ دینا گویا ''لقمان را حکمت آموختن'' کے برابر ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ

میں تحقیق اور تفتیش کا ایک خاص مادہ ہے کیا مجال جو کوئی ایسی چیز آپ کی نظر کے سامنے سے گزر جائے جس کو آپ نہیں جانتے ہیں اور آپ اس کو جاننے کی کوشش نہ کریں' اسی وقت ضروری سے ضروری کام کو چھوڑ کر تحقیقات شروع کر دیں گے اور جب تک خوب اچھی طرح سمجھ نہ لیں گے اس وقت تک اپنی تحقیقات کو ختم نہ کریں گے' مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ مطبع میں کھڑے ہوئے مشین میں برقی موٹر لگوا رہے تھے کہ مشین میں نے برک لگا کر مشین کو بند کر دیا بس اب آپ کو یہ فکر ہوئی کہ یہ کہاں سے چل کر کس راستے سے کہاں گیا ہے اور کس طرح مشین کو بند کر دیتا ہے' مشین میں نے آپ کو خوب اچھی طرح تشریح کے ساتھ سمجھایا اور جب آپ سمجھ گئے تو نہایت اطمینان کے ساتھ کہنے لگے' یہ لوگ بھی کیا کیا ترکیبیں لڑاتے ہیں' مولانا نیاز کو اور مجھ کو ان کے اس بیساختہ جملہ پر ہنسی آ گئی اور مولانا نیاز نے فرمایا'' دیکھئے یہ ہے فرق اہل زبان اور غیر اہل زبان کا کہ ترکیبیں لڑانا کوئی غیر اہل زبان نہیں بول سکتا تھا'' اب یہاں سے زبان کا مسئلہ چھڑ گیا' آپ نے سنجیدگی سے مسکرا کر فرمایا'' واقعی غیر اہل زبان کیا خاک سمجھے گا کہ ترکیبیں کس طرح لڑائی جاتی ہیں اسی طرح ایک مرتبہ سرکہ کے متعلق بحث ہو گئی بات یہ تھی کہ نسیم صاحب کو سرکہ سے پیدائشی نفرت ہے آج تک کبھی چکھا تک نہیں ہے اور نفرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی مولوی اپنے وعظ میں بیان کر دے کہ جنت میں ایک سرکہ کی بھی نہر ہو گی تو شاید نسیم صاحب جنت کا خیال بھی دل سے نکال دیں' ہاں تو وہ بحث اس لئے شروع ہوئی کہ آپ کو شہد بھی مرغوب نہیں ہے اور وصل صاحب بلگرامی اپنے پہاڑ سے منگائے ہوئے شہد خالص کی داد چاہتے تھے کہ اس راز کا انکشاف ہو گیا اب کیا تھا دونوں اپنی اپنی جگہ پر زبردست مناظرہ کرنے لگے البتہ کم بختی ان لوگوں کی تھی جو سامع کی حیثیت سے وہاں موجود تھے' خدا کی پناہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخر میں کانوں نے سننا اور دماغ نے سمجھنا چھوڑ دیا ان دونوں میں سرگرم بحث ہو رہی تھی لیکن ہمارے کانوں میں سوائے چیں چیں اور چیخ چیخ کے کوئی آواز نہ آتی تھی اور خدا جانے کہ آخر میں کون جیتا' بہرحال ہم نے آخر میں یہ دیکھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر پھولے بیٹھے ہیں اور دونوں کا دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہے یہ سب جھگڑا اور اصل سرکہ کا پیدا کیا ہوا تھا اور اس جھگڑے کے علاوہ ہم کو یقین ہے کہ نسیم صاحب سے ہر وقت سرکہ کو بحث میں لا کر لڑائی مول لی جا سکتی ہے پہلے تو وہ دلائل میں سرکہ کی غلاظت کو ثابت کریں گے لیکن جس وقت ان سے یہ کہا جائے گا کہ پیغمبر اسلام انے بھی سرکہ کی بے حد تعریف فرمائی ہے لہٰذا کم سے کم تم اس کو برا نہ کہو' اس وقت سرکہ کی بحث مذہبی بحث بن جائے گی اور اب نسیم صاحب اپنے عقائد کے اعتبار سے جن میں انگریزی قسم کی شریعت اور نئی روشنی کی مذہبیت کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور بوقت ضرورت بہت ہی دقیانوسی قسم کی شریعت کو بھی اپنا عقیدہ بنا لیا جاتا ہے بحث شروع کریں گے اور بحث کو کچھ ایسا الجھا دیں گے کہ وہ سرکہ سے شروع ہو کر نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتی ہوئی ابن سعود تک پہنچے گی اور آخر میں خود ان کو بھی یاد نہ رہے گا کہ یہ بحث دراصل شروع ہوئی تھی سرکہ سے اور بات میں بات پیدا ہو کر کہاں سے کہاں پہنچی اور اگر اتفاق سے بحث کے بعد یاد آ گیا یا کسی نے یاد کرا دیا تو اس تضیع اوقات پر ہنس کر اور تالی بجا کر افسوس فرمائیں گے کہ'' لاحول ولا قوۃ'' بات کیا تھی

اور ہوگئی کیا مگر اب وقت بہت ہوگیا ہے السلام علیکم۔"

البتہ شکر خوری کے معاملہ میں تو آپ کا جواب ہی نہیں ہے بس اس کو حد سمجھیے کہ اگر آپ کو زندگی بھر شکر' گڑ' راب' مٹھائیاں اور دوسری میٹھی چیزوں کے علاوہ نمک قطعاً نہ دیا جائے تو بھی شاید مٹھائی سے ان کا دل نہ بھرے' حال یہ ہے کہ مٹھائی کا نام آجائے پھر دیکھیے کہ نسیم صاحب کے منہ کے اندر ہی اندر کیسے کیسے قوام تیار ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بس رال ٹپک ہی پڑے گی۔ بازار میں چلے جارہے ہیں کہ چلتے چلتے ایک جگہ پر ٹھہر گئے ہم لوگ تو ان کے ساتھ رہتے رہتے اس موٹر فیل ہوجانے کا مفہوم سمجھ چکے ہیں کبھی ان سے ٹھہرنے کی وجہ نہیں پوچھتے' بلکہ ان سے پوچھنے سے پہلے خود ہی چاروں طرف دیکھ لیتے ہیں کہ حلوائی کی دکان کدھر ہے اس کے بعد ان سے پوچھتے ہیں کہ خیریت تو ہے؟" اور اسکا جواب وہ ہمیشہ یہی دیتے ہیں کہ "دیکھو تو کیا تازہ تازہ حلوا سوہن رکھا ہوا ہے اور کس قدر عمدہ امرتیاں ہیں" یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہر مرتبہ وہ مٹھائی خریدنے کے لئے کھڑے ہوجائیں بلکہ بعض اوقات تو وہ محض اس لئے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ مٹھائی کی دکان کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے انسان پیدا ہونے اور مکھی یا چیونٹا نہ بننے پر غور کریں' اگر کہیں خداوند کریم ان کو بجائے نسیم انہونوی کے مگس تھال حلوائی "یا زنبور خوانچہ شیرینی فروش یا کم سے کم شیرے کے مٹکے پر لپٹی ہوئی چیونٹی بنا دیتا تو وہ اس کے سوا پھر اور کچھ نہ مانگتے اور اسی زندگی کو اپنی جنت سمجھتے لیکن اب تو وہ باوجود دن رات مٹھائی کھانے کے مٹھائی کے لئے صرف اس امید پر ترس رہے ہیں کہ جنت میں جاتے ہی لنگوٹ باندھ کر جو شیرے کی نہر میں غوطہ لگائیں گے تو پھر اس نہر کے دریائی جانور ہوکر رہ جائیں گے اور کبھی باہر نہ نکلیں گے یعنی یہ شکر خوری کی انتہا تو ملاحظہ فرمایئے کہ اگر کسی وقت اتفاق سے کھانے میں کوئی میٹھی چیز نہ ہو تو حلق تک پیٹ بھر لینے کے بعد بھی آپ گویا بھوکے رہ جائیں گے اور آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ گویا کھانا نہیں کھایا ہے' جن احباب کو آپ کی اس مکھیوں والی بھنبھناہٹ کا علم ہے وہ تو خیر دعوت وغیرہ کے موقع پر آپ کے لئے میٹھے قورمہ تک کا انتظام کر دیتے ہیں لیکن جو اب تک لاعلم ہیں ان کے یہاں دعوت میں شریک ہوکر اور ماحضر تناول فرما کر بھی آپ ہمیشہ یہی کہتے ہوئے گھر واپس ہوتے ہیں۔

اے ذوق شکر خوری ہے تکلیف ہے سراسر
آرام سے وہ ہیں جو شکر ہی نہیں کھاتے

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرکہ سے آپ کو نفرت ہے اور مٹھائی سے عشق لیکن اگر مٹھائی میں سرکہ یا سرکہ میں مٹھائی ملا کر دی جائے تو آپ کیا کریں گے؟ سوال تو بہت ٹیڑھا ہے لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے کہ آپ کی سرکہ سے نفرت' مٹھائی سے عشق پر غالب آجائے گی اور آپ سرکہ آمیز مٹھائی کو کبھی نہ چھوئیں گے لیکن آپ کو افسوس ضرور ہوگا کہ کاش یہ مٹھائی سرکہ کی آمیزش

سے ہمارے لئے نا قابل استعمال نہ بنائی جاتی اور ہم اس کو کھا سکتے۔

نسیم صاحب کی مرغوب ترین چیز تو ہر وہ چیز ہے جس میں شکر ہو لیکن سرکہ نہ ہو مگر نفرت بہت سی چیزوں سے ہے مثلاً پرندوں کا گوشت' ہر قسم کا شکار اور مچھلی وغیرہ' گویا یہ جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی چھری نے اچھل کر آسمان پر ٹڈی کو اور دریا میں مچھلی کو حلال کیا تھا یہ سب آپ کے نزدیک بے کار تھا' مچھلی آپ کے لئے بدستور حرام رہی اور ٹڈی کو بھی آپ کھانے کی چیز نہیں بلکہ فصل خراب کرنے کی آسمانی آفت سمجھتے ہیں اب رہی مرغی اور مرغ' بٹیر اور تیتر' کبوتر اور چہا وغیرہ ان کو آپ اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ آپ ایک سرے سے ان کو ذبح کرنے ہی کے مخالف ہیں اور ان ہی کو ذبح کرنا کیا معنی آپ تو اس قسم کے مجاہد واقع ہوئے ہیں کہ بقرعید کی قربانی سے لے کر تقریب ختنہ تک کے انتہائی مخالف ہیں اور اس کی وجہ صرف آپ کی وہ رحمدلی ہے جو اپنی انتہا کو پہنچ کر بزدلی ہو جاتی ہے یعنی حال یہ ہے کہ آپ کے سامنے مرغی تک نہیں ذبح کی جا سکتی' بکری تو پھر بکری ہے اور ذبح کرنا تو پھر بھی موت اور زندگی کا معاملہ ہے ختنہ میں تو اس کا کوئی ڈر نہیں ہوتا لیکن آپ اپنی نظروں سے کسی کو خون بہا کر مسلمان ہوتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتے' واہ رے میرے بہادر۔

اے میں صدقے رن میں جاؤ گے اسی انداز سے

رہ گئی آپ کی اذیت اس کا یہ حال ہے کہ رات کو دس بجے سے لے کر ایک بجے رات تک بلا ناغہ روزانہ ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ اٹھایا قلم اور گھسیٹا کاغذ' بس پھر کیا تھا ایک ہی نشست میں لکھ ڈالا' آٹھ دس صفحہ کا ایک افسانہ اور سو گئے صبح تڑکے یعنی چھ بجے کے قریب بیدار ہو گئے یہ جوانی کی راتیں دیکھئے اور پانچ چھ گھنٹہ سونا دیکھئے یہ امنگوں کے دن دیکھئے اور بائیسکل پر ورنہ پیدل اپنے دفتر سے پریس اور پریس سے بلاک سازی کے کارخانے اور وہاں سے یہاں کی خاک چھاننا ملاحظہ فرمایئے خدا ان کو اس محنت کا پھل دے گا یا نہیں' یہ تو دوسرا سوال ہے لیکن رونا تو اس پر آتا ہے کہ یہ جوانی یوں ہی گزر رہی ہے اور اس بندہ خدا کو ذرا بھی احساس نہیں اور اگر ہم کچھ کہیں بھی تو وہ یہی جواب دیں گے کہ ''تو کیا آپ کی طرح آرام طلب ہو جاؤں''

بہت سے احباب کو یہ شوق ہے کہ نسیم صاحب کی زندگی کے اس پہلو کو بھی دیکھا جائے جس کا نام ہے تخلیہ اور جہاں صرف ایک مرد اور عورت اس لئے ہوتے ہیں کہ دونوں میں سے جو پرستار ہو وہ پرستش کرے اور جو قابل پرستش ہو وہ مہادیو بنا بیٹھا رہے۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ مرد ہی کو پجاری بنا پڑتا ہے اور عورت کی فطرت میں معبودیت ہے لیکن نسیم صاحب کے متعلق ہماری یہ رائے ہے کہ ان کے یہاں تخلیہ میں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا ہو گا کہ یہ ادھر اکڑے بیٹھے ہیں اور وہ ادھر اکڑی بیٹھی ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم مجازی خدا ہیں

اور وہ کہتی ہیں کہ میں بت ساز ہوں یہ کہتے ہیں میری پرستش کرو اور وہ کہتی ہیں میری پرستش کرو، یہ کہتے ہوں گے بڑی خوبصورت بنتی ہیں وہ کہتی ہوں گی ’’پہلے اپنی صورت تو دیکھو‘‘ مختصر یہ کہ ادھر ناز حسن ہوگا تو ادھر بھی آپ کی دعا سے پندار عشق نہیں بلکہ پندار حسن ہی ہوگا لیکن سنا ہے کہ نسیم صاحب کے صاحبزادے کی والدہ ماجدہ اپنی قسم کی اللہ میاں کی گائے واقع ہوئی ہیں اور وہ بھی مرکھنی نہیں لہٰذا ممکن ہے کہ یہ دو طرفہ اکڑفوں نہ ہوتی ہو لیکن جن لوگوں کو یہ شوق ہے کہ نسیم صاحب کی زندگی کے اس رخ کو بھی دیکھیں وہ تو صرف اس لئے ہے کہ باہر تو وہ عورت ذات کو دیکھ کر ایسا شرماتے ہیں گویا اگر تنہائی میں کوئی عورت ان کو مل جائے تو شاید یہ حضرت زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا یہی تو دیکھنا ہے کہ ’’چوں بخلوت می روند‘‘ اس وقت کیا ہوتا ہوگا لیکن شرط یہی ہے کہ خلوت میں بجائے عورت کے کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے مع بچھڑے کے نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں عورت ہیں۔ بہر حال ہماری رائے میں نسیم انہونوی اپنی قسم کے پہلے اور آخری انسان ہیں اور تعجب ہم کو ہے کہ وہ اس دور میں کیوں پیدا ہوئے جبکہ ان کو دیوانہ بریلوی کی طرح کے تما احباب بالکل انہونوی قسم کا انسان سمجھتے ہیں کچھ بھی ہو لیکن ہم تو یہی کہیں گے کہ اے نسیم انہونوی۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

◆◆◆

معاف کیجئے گا

جس طرح ہر مرض کی دوا درود شریف ہے' بالکل اسی طرح ''معاف کیجئے گا'' بھی عجیب پر تاثیر عمل ہے کہ کسی کے منہ پر تھوک دیجئے۔ کسی کو اٹھا کر پٹک دیجئے' کسی کے ٹیپ جھاڑ دیجئے' کسی کو گالی دیجئے' کسی کے بید رسید کر دیجئے' کسی کو بائیسکل سے گرا دیجئے' کسی کا کوئی شدید سے شدید نقصان کر دیجئے لیکن جہاں آپ نے اس سے ''معاف کیجئے گا'' کہا اگر وہ شریف ہے تو فوراً یہی کہے گا کہ کوئی ہرج نہیں اور اگر یہ نہ کہے تو سمجھ لیجئے کہ اس شخص میں شرافت کا قطعاً اثر نہیں ہے اور یہ سمجھنے کے بعد آپ کو پورا اختیار ہے کہ اس الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے زرین اصول کو پیش نظر رکھ کر جتنا جی چاہے اس کو برا بھلا کہئے ایک آدھ بات کا تو وہ بھی سختی سے جواب دے گا لیکن بعد میں جب چاروں طرف جمع ہو جانے والے راہ گیر فیصلہ کریں گے تو وہ آپ ہی کے موافق ہو گا کہ سب اسی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں گے کہ وہ بیچارے تو اتفاقی غلطی پر ''معاف کیجئے گا'' کہہ رہے ہیں اور تو اکڑا ہی جاتا ہے پھر آپ سے سب کہیں گے کہ جائیے صاحب جائیے اس کو بکنے دیجئے۔ یہ گویا آپ کی فتح ہوگی اور آپ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے مجمع سے نکل کر اپنا راستہ لیں گے' آپ کی اس فتح کا راز دراصل یہی معاف کیجئے گا'' والا عمل ہے یہ تو ایک معمولی سی جھڑپ کی مثال پیش کی گئی ہے ورنہ یہ عمل تو ایسے ایسے معرکوں میں کام آتا ہے جہاں آپ تو آپ' آپ کے فرشتے بھی بغلیں جھانکنے لگیں یہ تو ایک معمولی سی بات ہے کہ کسی سفید پوش شریف مرد آدمی کو پیچھے سے جا کر ایک گھونسہ گھم سے رسید کیا اور جب اس بیچارے نے گھوم کر دیکھا تو آپ نے فوراً کہا ''معاف کیجئے گا'' میں سمجھا تھا کہ مرزا ہیں اور آپ پیچھے سے بالکل ''مرزا'' معلوم ہوتے ہیں'' معاف کیجئے گا'' یہ سن کر وہ بیچارے سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہے کہ اپنی پیٹھ سہلائے اور مسکرائے اور آپ سے کہہ دے کہ ''کوئی ہرج نہیں جناب کوئی ہرج نہیں'' ''کوئی ہرج نہیں'' ایسے ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے جہاں سوائے فوجداری کے اور کوئی بات ہی نہ ہو سکے یعنی آپ نے پان کی پچکاری دہان مبارک سے اس طرح چھوڑی ہے کہ کسی بیچارے کی قیمتی شیروانی پر پڑی آپ تو خیر بیساختگی میں یا گھبرا کر ''معاف کیجئے گا'' کہہ ہی دیں گے لیکن وہ حضرت بھی دامن جھٹک کر کوئی ہرج نہیں اس طرح کہیں گے گویا کچھ ہوا ہی نہیں حالانکہ اگر آپ نے ''معاف کیجئے گا'' والا عمل نہ پڑھا ہوتا تو خدانخواستہ سڑک ہی پر کشتی کے ایسے داؤں پیچ دیکھنے میں آتے ہیں جن کے لئے عظیم الشان دنگل منعقد کئے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ کے کپڑوں کی وہ درگت بنتی کہ شاید ''لندن واشنگ کمپنی'' بھی ان داغہائے ''گدم پٹنا'' کو صاف نہ کر سکتی' معمولی

دھوبیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے یا اگر وہ ان کو صاف کر لینے کی قسم ہی کھا لیتی، تو ان زخموں کا علاج شاید مدتوں ہوتا جو گھٹنوں اور کہنیوں پر اس معرکہ میں آ جاتے ہیں اب رہی عزت و آبرو اس کا ہم ذکر ہی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ شریف آدمیوں میں اس طرح آ جاتی ہے جیسے جائیداد غیر منقولہ ایسی ویسی معمولی باتوں سے وہ جایا نہیں کرتی۔ یہ ایک معمولی سی لڑائی ہے ہم نے تو اس ”معاف کیجئے گا“ کی تاثیر میں ایسے موقعوں پر بھی دیکھی ہیں جہاں اچھے خاصے بلوہ کا اندیشہ ہو جس کے لئے دفعہ 144 کا نفاذ حفظ ماتقدم کے طور پر ہوتا ہے یعنی لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں ایک مقرر جب تقریر کرتے کرتے حاضرین کو گالیاں دینا چاہتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ”معاف کیجئے“ آپ حضرات بڑے معقول ہیں اور معاف کیجئے گا آپ لوگ بالکل بیوقوف ہیں اور معاف کیجئے گا آپ لوگ عورتوں سے بھی بدتر ہیں اور معاف کیجئے گا آپ لوگ جانوروں کے برابر ہیں، غرضیکہ معاف کیجئے گا کہہ کر اس کا جو جی چاہتا ہے کہتا ہے اور سننے والے اس طرح سنتے ہیں گویا کسی اور کو کہا جا رہا ہے، اس میں در حقیقت ان کی بے حمیتی نہیں ہے بلکہ یہ ”معاف کیجئے گا“ کا سحر ہے جس سے تمام مجمع مسحور ہو جاتا ہے اور ان ہی گالیوں کو بخندہ و پیشانی سنتا ہے جن کو اگر ”معاف کیجئے گا“ کے بغیر کہا جاتا تو شاید حاضرین اپنی اور مقرر صاحب کی جان ایک کر دیتے۔ اس ”معاف کیجئے گا“ کا رواج عام طور پر مہذب سوسائٹیوں میں زیادہ ہے اس لئے کہ وہاں کے لوگوں کو اس کے جواب میں ”کوئی ہرج نہیں“ کہنا آتا ہے ورنہ جاہلوں سے تو اگر ”معاف کیجئے گا“ کہا جائے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ ”ایک تو مارا اس پر کہتا ہے معاف کیجئے گا“ لیکن مہذب لوگوں میں اس کا اندیشہ نہیں انگریزی داں طبقوں میں ”یہی معاف کیجئے گا“ عام طور پر ”I AM SORRY“ کے نام سے مشہور ہے اور کوئی ہرج نہیں۔ وہ لوگ ”NOMTTE“ کہتے ہیں ہر روز بڑے سے بڑا ہنگامہ اسی سوال و جواب پر ختم ہو جاتا ہے۔

◆ ◆ ◆

بیکاری

بیکاری یعنی بے روزگاری اس اعتبار سے تو نہایت لاجواب چیز ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کا انسان اپنے گھر میں تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر اس طرح رہتا ہے کہ ایک شہنشاہ ہفت اقلیم کو اپنے محل میں وہ فارغ البالی نصیب نہیں ہو سکتی، سچ تو یہ ہے کہ وہ دولت جس کو تمام دنیا کے سرمایہ دار اپنی جان اور اپنا ایمان سمجھتے ہیں ایک ایسا مستقل عذاب ہے جو انسان کو کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتا، سرمایہ داروں کی تمام زندگی بس دو ہی فکروں میں کٹتی ہے ایک یہ کہ اگر ہمارا روپیہ چور لے گئے تو کیا ہو گا؟ یہ دونوں فکریں اپنی اپنی جگہ ایسی ایسی مہلک ہوتی ہیں کہ ان کو بھی دق کی منجملہ دیگر اقسام کے سمجھنا چاہیے بلکہ دق کی دوسری قسمیں تو معمولی ہیں مثلاً پھیپھڑے کی دق آنتوں کی دق، ہڈی کی دق، وغیرہ مگر یہ فکریں دل اور دماغ کی دق سے کم نہیں جن کا مارا ہوا نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے بس توند بڑھتی جاتی ہے اور دل چھوٹا ہوتا رہتا ہے مختصر یہ کہ ان سرمایہ داروں کی زندگی حقیقتہ کشمکش جبر واختیار میں بسر ہوتی ہے کہ نہ زندہ رہتے بن پڑتی ہے نہ مرنے کو دل چاہتا ہے اب رہے غریب ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ بلا ضرورت پیدا ہو گئے اور جب جی چاہا مر گئے، نہ جینے کی خوشی تھی نہ مرنے کا کوئی غم۔

اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ چاہے ہم کو بے روزگاروں کی جماعت گالیاں دے یا سرمایہ داروں کا طبقہ انعام، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ دنیا کے لئے بیکاری ایک رحمت ہے حالانکہ اس رحمت سے ہندوستان کے علاوہ تمام دنیا کے ممالک چیخ اٹھے ہیں اور ہر طرف سے "ہائے پیٹ ہائے پیٹ" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ ہائے پیٹ کی صدائیں پیٹ پھٹا کی صداؤں کے مقابلے میں پھر بھی قابل برداشت ہیں لوگ کہیں گے کہ عجب الٹی سمجھ کا آدمی ہے کہ ترلقمے پر فاقے کو ترجیح دیتا ہے لیکن جناب ہم اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ فاقہ اسی وقت تک فاقہ ہے جب تک ترلقمے کی امید انسان کے پیش کو جہنم اور معدے کو ربڑ کا بنائے ہوئے ہے لیکن اگر انسان ترلقمے سے خالی الذہن ہو جائے تو یہی فاقہ اس کے لئے سب کچھ ہو سکتا ہے، مرزا غالب مرحوم نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی قسم کی ایک بات کہی ہے جس کا ترجمہ ہمارے الفاظ میں یہ ہوا کہ

فاقہ کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتی ہے بھوک
اس قدر فاقے پڑے ہم پر کہ لقمہ بن گئے

ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ معمولی سمجھ کے انسانوں کے لئے بیکار ہے لہٰذا اس کا کہنا بھی فضول سی بات ہے اور نہ اس وقت ہم اس قسم کی بلند باتیں کرنا چاہتے ہیں ہم تو اس وقت بیکاری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جس کے خلاف تمام دنیا میں احتجاج کا ایک شور مچا ہوا ہے بیکاری اچھی چیز ہے یا بری اس کے متعلق ہم اپنے ذاتی خیال کو اگر تفصیل کے ساتھ پیش کریں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ یا تو ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی ورنہ یہ تمام دنیا کی تجارت' کاروبار اور ملازمتیں وغیرہ سب مفلوج ہو کر رہ جائیں گی' لہٰذا دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ذرا ڈر معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھے' اس لئے بہترین صورت یہی ہے کہ عام نقطہ نظر سے ہم بھی بیکاری کو برا فرض کرنے کے بعد اپنے ''خامہ سے'' چل بسم اللہ کہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ نئی اور پرانی دنیا ملا کر جو کرہ ارض بنتا ہے اس میں تین چوتھائی تو ''بحرالکاہل'' ''بحرالغافل'' ''بحرالجاہل'' وغیرہ کی قسم کے بڑے بڑے سمندر ہیں یعنی پانی ہی پانی اب رہ گئی ایک چوتھائی دنیا جو خدا نظر بد سے بچائے خشکی ہے اس چوتھائی دنیا میں ان لق و دق صحرا سر بفلک پہاڑ' ریگستان جن کو انسان سے کوئی تعلق نہیں بس شترستان کہنا چاہیے اور جھیلیں' دریا' نالے وغیرہ ہیں باقی جو بچی تھوڑی خشکی اس میں کھیت اور باغ وغیرہ سے بچی ہوئی خشکی کو گاؤں' تحصیل' پرگنہ' شہر' ضلع' صوبہ' ملک اور براعظم وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور یہ ہے وہ مختصر سی گنجائش جس میں اشرف المخلوقات مع چرندوں پرندوں' درندوں کے رہتے ہیں' اس محدود گنجائش میں آبادی کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے' دنیا کی وسعتیں محدود ہیں اور نسل انسانی کی ترقی غیر محدود' اب جو لوگ بیکاری کا رونا روتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ دنیا کا قصور ہے یا دنیا کے بسنے والوں کا ہاں اگر نظام فطرت ہوتا کہ ہر انسان کے ساتھ ساتھ ایک آدھ بیگھ زمین بھی پیدا ہوا کرتی تو واقعی بیکاری کے متعلق ہماری تمام شکایتیں حق بجانب تھیں مگر اب تو ہر نیا پیدا ہونے والا اس چھوٹی سی دنیا میں گنجائش حاصل کرنا چاہتا ہے جو باوا آدم کے وقت سے لے کر اب تک یعنی از آدم ایں دم ایک انچ بھی نہیں بڑھی' آپ کہیں گے وہ بڑھی کیوں نہیں' یہ جو کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگا کر اس دنیا میں ایک اور اضافہ کیا وہ کدھر گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے سے موجود تھا' جب تک انسان کی جستجو میں کامیاب ہونے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی وہ پوشیدہ رہا اور جب اس کو ڈھونڈھا گیا تو وہ مل گیا لیکن اب یہ امید رکھنا کہ کوئی اور امریکہ مل جائے گا غلط ہے اس لئے کہ اب انسان کو بیکاری کے غم نے یا تو اس قدر پست ہمت کر دیا ہے کہ وہ اپنے گردو پیش پر نظر ڈالنے میں بھی کاہلی سے کام لیتا ہے یا سرمایہ داری نے ایسا دماغ خراب کر دیا ہے کہ مریخ پر حکومت کرنے کی فکر ہے ممکن ہے کہ کبھی یہ ہوا میں قلعہ بنانے کی جدوجہد کامیاب ہو جائے لیکن ابھی تو ہم دنیا سے جا کر مریخ میں آباد ہونے کے لئے تیار نہیں۔

لاحول ولاقوۃ...... کہاں سے کہاں پہنچے ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ انسان کی کثرت نے دنیا میں بیکاری کی وبا پھیلا دی ہے، بات یہ ہے کہ بڈھے تو مرنے کا نام نہیں لیتے اور بچے پیدا ہونا بند نہیں ہوتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے اب یہ دیکھئے کہ جہاں پانچ بچے تعلیم حاصل کرتے تھے وہاں اب پانچ ہزار تعلیم حاصل کرتے ہیں پہلے تو یہ تھا کہ یہ پانچ بچے پڑھنے کے بعد پانچ جگہوں پر ملازم ہو جاتے تھے ملازمت کرتے تھے پنشن لیتے تھے اور مر جاتے تھے لیکن ان کے امیدوار بجائے پانچ کے پانچ ہزار ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پانچ تو بدستور سابق برسرکار ہو جائیں گے، اب رہے چار ہزار نو سو پچانوے وہ یقینی طور پر بیکار رہیں گے۔ یہ غلطی دراصل حساب کی غلطی ہے کہ اب آمد و خرچ برابر نہیں رہا پہلے یہ ہوتا تھا کہ ادھر پانچ بچے پیدا ہوئے تو ادھر پانچ بڈھے مر گئے ادھر پانچ امیدوار ملازم ہوئے تو ادھر پانچ ملازموں نے پنشن لے لی لیکن اب بڈھوں نے مرنا ترک کر دیا ہے اور بچے برابر پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں اس صورت میں کوئی کوئی بڑے سے بڑا ریاضی داں ہم کو بتائے کہ حساب فہمی کا آخر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اب یہ دیکھئے کہ پانچ ہزار میں سے پانچ کے برسرروزگار ہو جانے کے بعد جو باقی بچے تھے چار ہزار نو سو پچانوے وہ گویا سب کے سب بیکار ہوئے ان بیچاروں کا یہ حال ہے کہ خدا دشمن کا بھی نہ کرے، ہائے وہ طالب علمی کی امیدیں کہ بس پاس ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری اپنے گھر کی لونڈی ہے فارغ التحصیل ہوئے اور آنریبل بنے اگر گورنر نہیں تو اس کے کونسلر ضرور ہی ہو جائیں گے لیکن جب پڑھنے کے بعد درخواستیں بھیجنا شروع کیں تو ہر جگہ سے نامنظور ہو کر بواپسی ڈاک گھر آ گئیں، اب بتائیے کہ اس وقت وہ بیچارے کیا کریں، تو گھبرا کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے کوئی تجارت کی طرف رجوع ہوتا ہے کوئی ڈپٹی کلکٹری سے ناامید ہو کر ریلوے میں ٹکٹ کلکٹری کر لیتا ہے، کوئی بجائے آنریبل ہونے کے کلریکل لائن میں نکل جاتا ہے اور زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو بس ارادہ کرتے اور بدلتے ہیں تجاویز پر غور کرتے اور وہ رہ جاتے ہیں سکیمیں بناتے ہیں اور رد کرتے ہیں یعنی بس گھر پر بیٹھے ہوئے بچوں کو کھلاتے ہیں اور مزے کرتے ہیں ان لوگوں کو عام طور پر بیکار بیروزگار کہا جاتا ہے اور آج کل دنیا ان ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

نصیحت کرنے والے جو اتفاق سے بے روزگاری کے آلام و مصائب سے قطعاً آشنا ہوتے ہیں ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں میں آرام طلبی ایسی آ گئی ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کو دل ہی نہیں چاہتا، بس وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ گھر پر پڑے ہوئے چارپائی کے بان توڑا کریں اور روپے کی بارش ہوا کرے ان ناصح بزرگوں سے اب کون کہے کہ ”جناب والا یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ آپ کا سایہ ہم کمبختوں کے سر پر ہنوز قائم ہے حالانکہ آج کل عمر طبعی بس پچاس پچپن سال ہے یعنی پچپن سال کی پنشن پاتے

ہی انسان کو مر جانا چاہیے'' یعنی یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمایئے کہ دہری دہری عمر طبیعی پانے والے بزرگ مرنا تو بھول جاتے ہیں بس یاد یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی نازل کی ہوئی مصیبتوں پر بیکار نوجوانوں کو دن رات لعنت ملامت کیا کریں' حالانکہ قصور سب ان ہی کا ہے' یہی نوجوان جب بچے تھے تو ان ہی قبرستان کا راستہ بھول جانے والے بزرگوں نے ان بیچاروں کو پڑھانا شروع کیا تھا اور تمام زندگی زبردستی پڑھاتے رہے یہاں تک کہ پڑھانے والے تو قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور پڑھنے والے ایک آدھ درجن بچوں کے باپ بن گئے اب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں اور باپ دادا سب کا پیٹ پالو تو بے چارے کہاں سے پالیں' آرام طلب بنا دینے والے آرام طلبی کا طعنہ دیتے ہوئے کس قدر اچھے معلوم ہوتے ہیں بیکار کر دینے والے بیکاری پر لعنت ملازمت کرتے ہوئے کیسے بھلے لگتے ہیں ان ناصحوں سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ کو اپنی اولاد کے بیکار ہونے کی فکر تھی تو آپ نے اس کو درزی کیوں نہ بنایا' بڑھئی کیوں نہ بنایا لوہار کیوں نہ ہونے دیا' جوتا بنانا کیوں نہ سکھایا اور تعلیم شروع کرانے سے قبل گلا گھونٹ کر کیوں نہ مار ڈالا' پہلے تو تمام زندگی بیکار ضائع کی سکول اور کالج کی ''لاٹ صاحبانہ'' زندگی بسر کرائی سوٹ' بوٹ' لونڈر کا عادی بنایا اور اس مغالطے میں مبتلا رکھا کہ آنے والا دور موجودہ دور سے زیادہ زرین اور خوشگوار ہے تو اب یہ شکوہ سنجیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور تمام دنیا کا تو خیر جو کچھ بھی حال ہو لیکن ہندوستان جنت نشان کا یہ حال ہے کہ یہاں بیکاری کے سب اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ گویا ہندوستان انسان کا مقصد حیات یہی بیکاری ہے جس میں سب مبتلا ہیں ہندوستان ایسے جاہل ملک کے پڑھے لکھے بھی دو کوڑی کے اور جاہل بھی دو کوڑی کے بلکہ جو بیچارے پیدائشی یعنی خاندانی جاہل ہیں ان کی حالت پڑھے لکھوں سے بدرجہا بہتر ہے اس لئے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال لیتے ہیں اور پڑھے لکھوں کا پیٹ ان کے متعلقین بھرتے ہیں اس وقت بیکاری کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر میں دیکھ لیجئے بہت سے محلے کے محلے ایسے نکلیں گے جہاں آپ کی دعا سے سب خود مختار یعنی آزاد ہوں گے کوئی کسی کا نوکر چاکر نہیں' اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر کھاتے کہاں سے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ آپ بھی دنیا کے تمام کام چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیے اور دیکھئے کہ خدا کھانے کو دیتا ہے یا نہیں؟ پہلے آپ جائیداد پر ہاتھ صاف کریں گے پھر بیوی کے زیور کی باری آئے گی پھر کپڑوں اور برتنوں پر نوبت پہنچے گی۔ مختصر یہ کہ خدا باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اور جمع کی ہوئی گھرستی کو رکھئے۔ بیوی کے لائے ہوئے زیور کو رکھے اور ان سب کو کوڑیوں کے مول خریدنے والے مہاجنوں کو رکھئے بہر حال آپ انشاء اللہ اچھے سے اچھا کھائیں گے اور جس قدر اچھی زندگی آپ کی گزرے گی وہ تو ان نوکر چاکر قسم کے برسرکار لوگوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی''

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ جس بیکاری سے ایک دنیا چیخ اٹھتی ہے اس سے ہندوستان کیوں گھبراتا ہے۔ ہندوستان تو بقول ہمارے

خداوندان نعمت کے ایک جاہل، وحشی غیر مہذب اور کالے آدمیوں کا ملک ہے یہاں اگر بیکاری ہے تو کیا تعجب جب یورپ ایسے متمدن، تعلیم یافتہ، مہذب اور گورے آدمیوں کے ملک میں یہ حال ہے کہ بے چارے صاحب لوگ ہر طرح ناکام ثابت ہو کر وہاں کے ہر شعبہ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ میم صاحبات براج رہی ہیں اگر خدانخواستہ ہندوستان میں بھی یہی صورت ہو جاتی کہ اندرون خانہ ایک دم سے بیرون خانہ اور بیرون خانہ ایک دم سے اندرون خانہ ہو کر رہ جاتے تو شاید یہاں کے لوگ ہندوستان کو حوا کی بیٹیوں کے لئے چھوڑ کر یا تو کسی ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں ابن آدم کی حکومت ہو یا خودکشی کر لیتے، اس لئے کہ یہ انقلاب ہندوستان کے مردوں کے لئے ناقابل برداشت ہے کہ ان کی بیویاں تو کچہری عدالت کریں اور وہ خود گھر داری کریں، بچوں کو کھلائیں، یعنی مرد پیدا ہو کر عورت کے فرائض انجام دیں تو جناب مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یورپ کی بیکاری پھر بھی قابل برداشت ہے کہ وہاں کے مرد تو بیکار عورتوں باکار ہو گئی ہیں ایک در بند ہوا تو دوسرا کھل بھی گیا اور ہمارے ہندوستان شریف کے تو دونوں در اس طرح بند ہوئے ہیں کہ گویا کنجی ہی کھو گئی لہٰذا اب کبھی کھلنے کی بھی امید نہیں ایسی صورت میں اگر ہندوستان کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیکاری ہمارا مقصد حیات ہے تو بتایئے کیا غلط سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ بیکار جدوجہد کر کے اپنی جان دے دیں یا بے معنی کوششوں کے پیچھے مر جائیں کیا کریں؟ اس بیکاری کا جو علاج ہے وہ ہندوستانیوں سے عمر بھر نہیں ہو سکتا اور اگر ہو سکتا ہے تو کر دیکھیں ہم جبھی جانیں کہ یورپ کے مردوں کی سی غیرت اور حمیت پیدا کر کے دکھائیں اور اپنے آپ کو عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جب یہ معلوم ہے کہ موجودہ دور ''دورالنساء'' ہے تو پھر بیکاری دور کرنے کی جدوجہد کرنا فطرت سے جنگ کرنا ہے یا نہیں؟

کیسی بیکاری اور کیسی کچھ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جس قدر بیکاری میں انسان کثیر المشاغل ہو جاتا ہے باکاری میں قطعاً نہیں ہو سکتا بیکاری خود ایک ایسا مشغلہ ہے کہ انسان اس سے کبھی فرصت نہیں ملتی، یقین نہ آتا ہو تو کسی بیکار انسان کا صرف ایک ہفتہ کا پروگرام دیکھ لیجئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کیا اتنا کام آپ زندگی بھر بھی کر سکتے ہیں یقینا ۳ آپ کو آپ کی دگنی عمر بھی ملتی تو شاید آپ اس ہفتہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے مثلاً ایک شخص بیکار ہے اور اس کو کسی مشغلے کی فکر ہے وہ سب سے پہلے ڈپٹی کلکٹری لے کر کمینڈری تک کے لئے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملازمت مل جائے اسی کے ساتھ ساتھ ارادہ ہے کہ آٹا پیسنے کی چکی لگا کر قسمت آزمائی کرے گا اور اس سلسلہ کا تمام حساب کتاب مرتب ہو چکا ہے لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر حیدر آباد میں کوئی ملازمت مل گئی تو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ ایک طرف یہ بھی دل چاہتا ہے کہ اگر سستی مل جائے تو ایک لاری خرید لی جائے بڑے نفع کی چیز ہے لوگوں نے ایک لاری خرید کر اتنا نفع اٹھایا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے پاس دس دس لاریاں ہو گئیں اور لکھ پتی بن گئے لیکن اگر ریلوے سٹیشن پر

کتابوں کے فروخت کرنے کی اجازت مل جائے تو کیا کہنا ہے دگنا اور چوگنا فائدہ ہے اور یہ ہنڈی کا کاروبار بھی بڑے نفع کی چیز ہے بس انسان مستقل مزاج اور محنتی ہو پھر روپے کی کوئی کمی نہیں اور ان سب سے اچھا تو یہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال لیا جائے اور اگر خدا توفیق دے تو روزانہ اخبار ہے تو بہتر کوئی بات ہی نہیں مختصر یہ کہ اس کے جتنے ارادہ ہوتے ہیں سب اپنی اپنی جگہ مستقل اور اس کا ذہن ہر جگہ کام کرتا ہے یہ خیالی سکیمیں جب عمل میں آ جاتی ہیں اس وقت کچھ نہ پوچھئے کہ کیا حال ہوتا ہے وہی بیکار انسان بیک وقت ڈپٹی کلکٹر سے لے کر تمام ان عہدوں پر جن کے نام اس کو یاد ہیں ملازم ہوگا نہ چکی کا بلا شرکت غیرے مالک ہوگا ریاست حیدر آباد میں اس طرح ملازم ہوگا کہ عنقریب کوئی ‘‘یار جنگ’’ ہونے کی بھی امید ہوگی لاری بلکہ لاریوں کا مالک ہوگا' ریلوے سٹیشن کی ٹھیکیداری کا شرف بھی حاصل ہوگا۔ ایک ادبی رسالہ کا مدیر اور ایک روزنامہ کا چیف ایڈیٹر بھی ہوگا۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں اس کے دماغ کی رسائی ہوئی ہوگی بس وہ اپنے نزدیک وہاں تھوڑی دیر کے لئے عالم تخیل میں سہی بہر حال کامیاب ضرور ہو گیا ہوگا اور اس فریب خیال نے اس بیچارے کی حالت اس کتے کی سی بنا دی ہوگی جو شیش محل میں ہر طرف اپنی ہی صورت دیکھ کر باولا ہو جانے کے قریب ہو' یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ کم یا زیادہ دنیا کے ہر بیروزگار جن پر بیکاری کا ہلکا سا حملہ ہوا ہے یا جنہوں نے اس حملے کا کامیاب مقابلہ کیا ہے وہ تو خیر اس قسم کی تمام تجاویز اپنے ذہن میں رکھیں گے اور انکے یہاں تمام صلاح مشورے لیں دل اور دماغ کے درمیان ہوگا یعنی ان کی سکیمیں اول تو کسی کو معلوم نہیں ہوں گی اور معلوم بھی ہوں گی تو مخصوص لوگوں کو لیکن وہ لوگ جو فطرتۃً کمزور واقع ہوئے ہیں یا جن کو بیکاری نے ہر اعتبار سے ضعیف بنا دیا ہے اس معاملے میں اسی قسم کے انسان ثابت ہوں گے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی ان کے پاس جائیے تو السلام علیکم وعلیکم السلام کے بعد جو اس مخصوص مبحث پر گفتگو شروع ہوگی تو اس وقت تک سلسلہ جاری رہے گا جب تک آپ خود اجازت ہے؟ نہ کہیں اور پھر گفتگو میں جس بیساختگی کے ساتھ متکلم محو اور بیخود ہو جاتا ہے اس کا تعلق بس دیکھنے سے ہے' اس وقت اگر آپ نے اس بیچارے کی گفتگو توجہ کے ساتھ سن لی تو آپ کا یہ احسان وہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ بلکہ آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ واقعی یہ بیچارہ صرف میری وجہ سے اب تک زندہ ہے ورنہ نہیں معلوم کب کا اس خود غرض دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا' آپ کی صورت دیکھتے ہی وہ فوراً آپ کی طرف بڑھے گا کہ ‘‘السلام علیکم بھائی! عید کا چاند ہو گئے' کہو کیسی طبیعت ہے اور بھاوج کا کیا حال ہے؟’’ اگر اس کے جواب میں کہیں آپ نے اس کا حال بھی پوچھ لیا کہ ‘‘خدا کا شکر ہے بھائی اچھا ہوں گھر میں بھی خیریت ہے تم اپنی کہو کہ اس درخواست کا کیا ہوا؟’’ بس اسی قدر کافی ہے گویا آپ نے اجازت دے دی کہ ہاں سناؤ' داستان امیر حمزہ’’ بس اس نے کہنا شروع کیا۔

تم کو نہیں معلوم ہوا لاحول ولا قوۃ اماں اس نے تو بہت طول کھینچا ہوا یہ کہ ڈپٹی صاحب نے اس کو کمشنر صاحب کے پاس بھیج دیا اور کمشنر صاحب نے لکھ دیا کہ جو چاہو کرو، ہم نہیں جانتے اب ڈپٹی صاحب کی پھونک نکل گئی کہ کہیں کمشنر صاحب نے غصہ میں تو نہیں لکھا میں جب گیا تو کہنے لگے ڈپٹی صاحب کہ کمشنر صاحب نے نامنظور کر دی، میں نے اپنے دل میں کہا یہ کیونکر ہو سکتا تھا جب یہ کمشنر صاحب بریلی میں سٹی مجسٹریٹ تھی تو میں نے ان کو بڑے دن کا کارڈ بھیجا تھا وہ مجھ کو جانتے ہیں خیر بھائی تو میں چپ ہو رہا اور میں نے وہی ٹھیکہ والی کوشش شروع کر دی لیکن تم نے کہا تھا کہ دکان کی فکر بھی کرتے رہو تو بھائی میں اس طرف سے بھی غافل نہیں، اب جو کچھ بھی خدا کر دے مگر آپ کی دعا سے امید ہے کہ سب کچھ ہو جائے گا۔ دکان امین آباد میں ہے جس میں چار در ہیں مگر وہ جن کے پاس ہے کہتے ہیں کہ میری ذاتی ہے میں اس کو خالی نہ کروں گا یہ بڑی مشکل ہے اگر کہیں وہ اس کی ذاتی نہ ہوتی تو بس مار لیا تھا، مگر اب کیا ہو؟ اور خوب یاد آیا یار وہ دواؤں والی ترکیب تو ایسی لاجواب ہے کہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے، بس تمام ہندوستان کے اخباروں میں اشتہار چھپوا دینا ہیں پھر کیا ہے جب فرمائش آئی لیا کوئلہ اور دیوار کا پلاسٹر اور دونوں کو ملا کر پیس لیا۔ بس دوا تیار ہے تو یار ایک دن بیٹھ کر اشتہار بنا ڈالو مگر تم تو ملتے ہی نہیں اور وہ سنگر کمپنی کی ایجنسی بھی یوں ہی رہ گئی تم اپنے وعدوں کو بالکل یاد نہیں رکھتے اچھا تو کل کی رہی ضرور دیکھو فرق نہ ہو“

یہ تمام تجاویز تھیں جنکی تحریک یا تائید میں آپ شریک تھے یا جن کا آپ سے کوئی تعلق تھا ورنہ ان حضرات کے ذہن میں تو نہیں معلوم کتنی تجاویز ایسی بھی ہوں گی جن سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں لیکن آپ کی طرح کے دوسرے ہمدردوں کو دلچسپی ہے مثلاً کسی نے تو یہ رائے دی ہوگی کہ ایک ہوٹل کھول لو اب اس شخص سے جو گفتگو ہوگی وہ تمام تر ہوٹل کے متعلق ہوگی کسی دوسرے شخص نے واشنگ فیکٹری کھولنے کی صلاح دی ہے تو اس سے واشنگ فیکٹری کے متعلق تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رہے گا کہ دھوبیوں کا انتظار کہاں سے کیا جائے کتنے دھوبی کافی ہوں گے کم از کم الماریاں، دو بڑی میزیں ایک آفس ٹیبل وغیرہ کی ضرورت ہوگی اور پھر کپڑا دھونے کی جگہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ وہاں پانی کی فراوانی بھی ہو اور وہ جگہ دکان سے قریب بھی ہو مختصر یہ کہ تمام نشیب و فراز صرف ایک تجویز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس تجویز کا تعلق بھی صرف ایک کرم فرما سے ہے، اسی طرح جتنے خدا نے ہمدرد پیدا کئے ہیں اتنی ہی مختلف تجاویز بھی ہیں لیکن ان حضرات کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی ہمدردی قبول اور ہر کام کو شروع کرنے کے لئے اس طرح آمادہ کہ بس گویا کل ہی سے شروع بھی ہو جائے گا۔ اگر آپ کو اپنی بتائی ہوئی ترکیبوں کے علاوہ ان تمام تجاویز کا علم ہو جائے جو آپ کے بے روزگار دوست کے ذہن میں ہیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ شخص ایسا دماغ رکھتا ہے جو خزانہ ہے تجاویز کا اور ہر تجویز کے ساتھ ایسی مکمل معلومات اس کے ذہن

میں محفوظ ہیں کہ وہ ’’زندہ انسائیکلو پیڈیا‘‘ بن کر رہ گیا ہے اور یہ سب اسی بیکاری کے طویل میں ہوا ہے جس سے وہ کسی نہ کسی طرح چھوٹنا چاہتا ہے۔

یہ جو آپ کثیر التعداد ادبی رسالے دیکھ رہے ہیں اور جو بے شمار نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر کی طرح کے انشا پرداز پیدا ہو گئے ہیں ان سب کے متعلق اگر آپ تحقیقات کریں گے تو ان کے عالم وجود میں آنے کا سبب زیادہ تر یہی بیکاری ہوئی ہوگی۔ انہوں نے بے کار ہونے کے بعد یہ سوچا کہ کچھ کرنا چاہیے اور کسی نے ان کو رائے دے دی کہ ادیب بن جاؤ‘ مضمون لکھا کرو‘ بس انہوں نے لکھنا شروع کر دیا اور ان ہی کی ترکیب کے پیدا ہونے والے رسالوں نے ان مضامین کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس ’’کند ہم جنس با ہم جنس پرواز‘‘ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرت جن کو حقیقتاً ادب سے کوئی تعلق نہ تھا ادیب بن گئے اور وہ رسالہ جو نہیں معلوم کیا تھا علمیٔ ادبی رسالہ بن گیا اب کر لیجئے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کہہ کر اپنی ’’شکست تھانویت‘‘ سے مستعفی ہو جائیں لیکن وہ لوگ تو آپ کی وجہ سے مضامین لکھنا چھوڑ نہیں سکتے جنہوں نے اپنی بے کاری کا علاج اسی کو سمجھا ہے اور جو اپنا پہاڑ کی طرح نہ کٹنے والا وقت مضمون لکھ کر کاٹتے ہیں ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ اگر ہم غیرت دار ہیں اور وہ خطرات مستقل مزاج لیکن اگر اسی کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر صاحبان رسالہ جات کی قدر شناسیاں بھی باقی ہیں تو ہم واقعی ایک ایسا اعلان کرنے کے بعد بعد غائب ہو جائیں گے کہ سب سچے دل سے کم از کم ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

◆ ◆ ◆

اتوار

وہ مبارک و مسعود دن جس کی قدر شاہ داند یا بداند جوہری" یعنی یا تو عیسائی سمجھ سکتے ہیں یا ہمارے ایسے ملازمت پیشہ ان لوگوں کا یہاں ذکر ہی نہیں جو گھر بیٹھے شنبہ یک شنبہ دو شنبہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکا کرتے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہفتہ کے بعد کونسا دن آنے والا ہے سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ اتوار کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک جیسے بدھ اور منگل ویسے ہی اتوار۔ اس اتوار کی قدر تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ یہی وہ دن ہے۔

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے

یقین کیجئے کہ اس دن کا انتظار پیر کے دن سے شروع ہو جاتا ہے بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے ایسے بیچارے ملازمت پیشہ خدا کے بندے اپنی ذاتی زندگی کا دن تمام ہفتہ صرف اتوار ہی کو سمجھتے ہیں اس کے علاوہ باقی تمام دن کی بندگی اور بیچارگی میں اس طرح گزارتے ہیں کہ ہم کو اپنے انسان ہونے کا ایک دفعہ بھی احساس نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مشین ہے اگر لکھنے والا بٹن دبا دیا گیا تو لکھ رہے ہیں اگر بیٹھنے والا پرزہ چلا گیا تو بیٹھے ہوئے ہیں، مختصر یہ کہ صبح ہوتے ہی دفتر آنا دفتر میں ایک مقررہ خدمت انجام دینا شام کو دفتر سے جانا سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کی ایک متحرک تصویر معلوم ہوتے ہیں ہم نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ علاوہ اتوار کے ہم انسان بھی رہتے ہیں یا نہیں اور نہ اس مسئلہ پر غور کرنے کا موقع ملا لیکن جب کبھی اتوار کے دن ہم نے اپنی زندگی پر غور کیا تو یہی نتیجہ نکلا کہ ہماری زندگی کے دن شمار کرنے والے جو چاہیں شمار کریں لیکن ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ بس اتوار کا دن تو ہماری زندگی کے دنوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اس کے علاوہ باقی دن تو خدا جانے ہم زندگی بسر کرتے ہیں یا زندگی ہم کو بسر کرتی ہے اب اس سے اندازہ فرمائے اگر بجائے بہادر شاہ ظفر کے آپ کے جناب غالب صاحب قبلہ ہم کو یہ دعا دیتے ہیں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تو یا تو ہم ان سے کہتے کہ قبلہ عالم یہ دعا آپ ہی کو مبارک رہے ہم کو تو ایسی دعا دیجئے کہ ہماری جتنی زندگی بھی ہے اس میں چاہے کچھ تخفیف کر دی جائے لیکن ہر دن اتوار بن جائے یا کم از کم ہفتہ میں دو تین مرتبہ تو اتوار آیا کرے ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک اتوار کا دن ہفتہ بھر کے بعد آتا ہے جس میں معمولی دنوں کی طرح بارہ گھنٹے ہوتے ہیں ان ہی بارہ گھنٹوں میں اپنی خوشی کھانا کھائے اپنی خوشی نہائے اپنی خوشی بال بنوائے اپنی خوشی سیر کو جایئے اور اگر کہیں اپنی خوشی سو رہے تو تمام کام آئندہ اتوار تک ملتوی یا اگر بیگم صاحبہ نے موقع غنیمت جان کر اور وقت کی قدر کرتے ہوئے اپنی خوشیاں پوری کرانا شروع کر دیں تو بس دن بھر گھر سے بزاز کی دکان' گھر سے اناج کی منڈی' گھر سے جوتے والے کی دکان' گھر سے گوٹا کناری' لیس' بانگڑی والے کی دکان کے سو سو چکر کاٹے او چورن چٹنی دال کا مسالہ فراہم کرتے کرتے شام کو اس طرح تھک کر پڑے رہیے گویا دن بھر ہل جوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہمارا تمام پروگرام ہفتہ بھر اتوار کے دن کے لئے ملتوی رہتا ہے اور اسی طرح بیگم صاحبہ بھی اتوار کی تاک میں لگی رہتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتوار کے دن ہمارا ذاتی پروگرام ایسا ہو جاتا ہے کہ ہفتہ بھر کا کھایا پیا نکلوا کر چھوڑتا ہے ہم تو تمام ہفتہ یہ کرتے ہیں کہ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور زیر لب کہہ دیا اب کی اتوار کو بنوائیں گے جوتے پر نظر پڑی اور طے کر لیا اب کی اتوار کو پالش ہو گی' کپڑوں کو دیکھا اور ارادہ کر لیا کہ "اب کی اتوار کو نہا کر بدلیں گے" کسی نے نہ ملنے کی شکایت کی تو وعدہ کر لیا کہ اب کی اتوار کو حاضر ہوں گا' کوئی مر گیا تو تعزیت کے لئے بھی اتوار کا دن مقرر کیا گیا کسی نے ہم سے ملنے کو کہا تو اتوار کا دن دیا کہیں سفر کو جانا ہے تو اتوار کے دن کی سفر کی ٹھہری' شکار کو دل چاہا تو اتوار پر اٹھا رکھا غرضیکہ تمام ہفتہ جو جو باتیں ہم کو اپنی زندگی کے متعلق یاد آئیں ہم نے سب کو اتوار کے سپرد کر دیا لیکن ہم کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اسی طرح بیگم صاحبہ نمک ختم ہونے پر کپڑے پھٹنے پر زیور ٹوٹنے پر غرضیکہ ہر بات پر اتوار کو یاد کیا کرتی ہیں اور اتوار کے دن ان کو وہ باتیں سوجھتی ہیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھ سکتیں وہ تو کہیے اس دن ہمارے دفتر کی طرح ہسپتال کچہریاں' ڈاک خانہ' مدرسے وغیرہ سب بند ہوتے ہیں ورنہ بچوں کو ہسپتال لے جانا' سکول میں نام لکھوانا وغیرہ بھی اسی دن پر اٹھا رکھا جاتا اور اب شکر ہے کہ ہم کو اس سے ایک طرح کی یکسوئی حاصل ہے اس میں شک نہیں کہ اتوار کے دن کی مشغولتیں معمولی دنوں سے دگنی اور چوگنی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اتوار کے عاشق صرف اس لئے ہیں کہ وہ تمام مشغولتیں ہم کو اپنی اور اپنی ذاتی زندگی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں اور باقی دنوں میں تو نہیں معلوم ہم کس طرح اور کس کے لئے جیتے ہیں۔

◆◆◆

یکہ

ہم تو کہیں گے کہ اس مغربی سیاح نے نہایت شرافت سے کام لیا ہے جس نے ہندوستانی یکہ کی تعریف صرف یہیں تک کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی مربع صندوق میں دو پہیئے لگا کر گھوڑا جوت دیا ہے ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا یکہ کسی طرح بھی ان تاریخی یادگاروں سے کم نہیں ہے جو عہد سلف کی یادگار کے طور پر دنیا کے برے بڑے عجائب خانوں میں حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں اور جن کو دیکھ کر ترقی یافتہ اقوام اپنی گزشتہ جہالت کے نمونے دیکھتی ہیں لیکن ہندوستان کا یکہ اہل ہند کی جہالت کی یادگار نہیں بلکہ جہالت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عجیب وغریب سواری کے موجد کا دماغ کس ساخت کا تھا جس میں سب سے پہلے یکہ کا نقشہ آیا جس کا کسی طرف سے کوئی تک ہی نہیں ہے لوگ تانگہ ہی کو کہتے ہیں کہ یہ سواری دنیا سے انوکھی ہے کہ مشرق کی طرف جانا ہو تو مغرب کی طرف منہ کر کے بیٹھیے اور مغرب کی طرف جانا ہو تو مشرق کی سمت نظر رکھیے لیکن یکہ کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہتا کہ یہ سواری کس طرف سے ہے۔ مغربی سیاح نے تو اپنی ناتجربہ کاری سے یہیں تک کہا ہے کہ ''مربع صندوق میں پہیئے لگا کر گھوڑا جوت دیا گیا ہے'' لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ اگر ان حضرت کو کبھی یکہ پر سوار ہونے کا اتفاق ہوا ہوتا تو وہ سوائے اس کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے کہ یکہ پر سوار ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں پہلوؤں میں پہیئے لگا دیئے ہیں اور ٹانگوں کو بم بنا کر گھوڑا جوت دیا ہے اس لئے کہ ان کے لئے تو یکہ کی سواری یقیناً نئی چیز ہوتی مگر ہم یکہ کی سواری کے عادی ہونے کے باوجود یکہ پر بیٹھنے اور یکہ کے چلنے کے بعد آج تک یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم یکہ پر سوار ہیں یا یکہ ہم پر یکہ ہم کو لئے جا رہا ہے یا ہم یکہ کو۔ ہمارے بیٹھنے اور گھوڑے کے قدم اٹھانے کے لئے ساتھ ہی پہیوں سے پیدا ہونے والی حشر خیز گھڑگھڑاہٹ کبھی یہ غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی کہ ہم یکہ پر کیوں بیٹھے ہیں اور ہم کو یہ غیر شریفانہ حرکت بھی کرنا چاہیے تھی یا نہیں اس لئے کہ تھوڑی دیر کے بعد گھوڑے کے قدم جلدی جلدی اٹھتے ہیں یکہ والے کی ٹخ ٹخ ہنر نوازی کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور یکہ میں بیٹھنے والے ہمارے اور آپ جیسے مسافر اس ٹینس کی گیند کی طرح خود بخود اچھلنے لگتے ہیں جو ریکٹ پر ہر مرتبہ گرے اور گر کر پھر اچھلے لیکن اگر یکہ پر ایک سے زیادہ یعنی دو یا تین آدمی سوار ہیں تو سب ایک دوسرے سے تمام راستہ میں اس طرح ٹکراتے ہیں گویا کسی پیپے میں پتھر بھر دیئے گئے ہیں اور اس کو ہلایا جا رہا ہے وہ تو کہیئے کہ انسان بڑی بے حیا مخلوق ہے ورنہ یکہ کی سواری کے بعد ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ جانا تو کوئی بات

ہی نہیں لیکن اس بے حیائی کے باوجود چلتے ہوئے یکہ پر منہ در منہ باتیں کرنا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں اور لوگ یہ جرات بھی کم کرتے ہیں اس لئے کہ خدا جانے کس وقت باتیں کرتے کرتے سر ٹکرا جائے اور اس قسم کے واقعات ہم نے بہ چشم خود دیکھے اور بگوش خود سنے ہیں کہ چلتے ہوئے یکہ پر درشتی بگھارنے والے دوستوں نے باتیں کرتے کرتے سر بھی پھوڑ لیا ہے اور پھر ایک دوسرے سے معاف کیجئے گا کہہ کر

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

بھی کہا ہے لیکن یہ قصے ہیں ان لوگوں کے جو یکہ کی سواری کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور اس پھانسی کے تختے سے ذرا بھی نہیں ڈرتے ورنہ کیسی باتیں کرنا کیسا کچھ یکہ پر بیٹھنے کے بعد حواس ہی کس کے قائم رہتے ہیں جو یہ باتیں کرے یکہ پر بیٹھنے کے بعد تو خیر ہم نے سوائے توبہ استغفار کرنے کے اور کسی بات پر آج تک غور ہی نہیں کیا ہے لیکن دوسروں کو یکہ پر سوار دیکھ کر البتہ ہمیشہ لطف آتا رہا ہے اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ یکہ پر سوار ہونے کے بعد انسان اچھا خاصہ تماشا ہو جاتا ہے اگر یکہ خاموشی کے ساتھ جا رہا ہے تو اس پر بیٹھے ہوئے حضرت کسی طرح بھی دسہرے کے ٹیسو سے کم نہیں معلوم ہوتے اور اگر یکہ کی تیزی یکہ نشین کو ''الف دو زیر ان' دو زیر ان دو پیش ان'' بنائے ہوئے جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ نٹ کا تماشا کس کو نہیں اچھا لگتا عجیب عجیب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کبھی تو یکہ نشین صاحب کا سر اقدس چھتری سے ٹکراتا اور وہ یکہ کا ڈنڈا چھوڑ کر اس کو سہلا بھی نہیں سکتے کبھی یکہ ان کو اس کھلونے کا ہم شکل بنا دیتا ہے جو ہر کروٹ سے گرنے کے بعد بیٹھا ہی رہتا ہے کبھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرت میں نہایت عمدہ اسپرنگ لگا ہوا ہے جو ان کو قرار ہی نہیں لینے دیتا' مختصر یہ کہ ایسی ایسی گت بنتی ہے کہ بس اس کا دیکھنے ہی سے تعلق ہے لیکن افسوس ہے تو صرف یہ کہ یکہ پر بیٹھنے والا خود اپنی ان ''چارلی چپلانہ'' حرکتوں کو نہیں دیکھ سکتا۔

یکہ پر سوار ہونا بھی کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے بھی بہت بڑے تجربہ کی ضرورت ہے ورنہ یکہ پر بیٹھ کر مرنے سے کہیں زیادہ یکہ کے نیچے کچل کر مرنا آسان ہے اس لئے کہ کوئی یکہ یکساں نہیں ہوتا اگر آج ہم ایک یکہ پر سوار ہو چکے ہیں اور اس کے تمام نشیب و فراز بخوبی سمجھنے کی کوشش کی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ ہم دوسرے یکہ پر اپنے پہلے تجربہ کو کام میں لا سکیں گے غلط فہمی ہمیشہ یکہ نشینوں کو دھوکا دیتی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یکہ کی ہزارہا قسمیں جن میں سے دو موٹی موٹی قسمیں ''اولاڑ'' اور ''دباؤ'' ہیں فرض کیجئے کہ آپ کسی ایسے یکہ پر بیٹھے ہیں جو آپ کو پیچھے کی طرف گرائے دیتا ہے جس کا گھوڑا بہت اونچا ہے جس کے بم آسمان سے باتیں کر رہے ہیں تو وہ یکہ از قسم ''اولاڑ'' ہے اور اس پر آپ کو اونٹ گاڑی کا لطف آئے گا بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اونٹ

گاڑی ہی کی چھوٹی قسم ہوتی ہے اس یکہ پر بیٹھنے کے لئے اس بات کی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے کو گھوڑے سے قریب رکھنے کی کوشش کی جائے اور اپنا تمام بوجھ بموں کو جھکانے کے لئے یکہ کے اگلے حصہ کی طرف رکھنے کی کوشش کی جائے ورنہ گھوڑے کے قدم زمین سے اٹھ جائیں گے اور وہ ترازو کے ہلکے پلڑے کی طرح اس طرح اٹھا جائے گا کہ آپ بانٹ والے پلے کی طرح زمین پر آ رہیں گے یا آپ کے بوجھ سے گھوڑے کا سینہ بند وغیرہ ٹوٹ جائے گا اور آپ کو ایک دھماکے کی آواز کے بعد خبر ہوگی کہ گر پڑے ہیں' گھوڑا اگر شریف ہے تو کھڑا رہے گا ورنہ اس کا جو جی چاہے کرے وہ آزاد ہے اور آپ قسمت کے لکھے کے پابند جو کچھ مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اسی طرح یکہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو "دباؤ" کہتے ہیں اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی تمام علامات پہلی قسم کے بالکل برعکس ہوں گی۔ یعنی گھوڑا نیچا ہوگا اور یکہ اونچا' آپ بجائے پیچھے کے اوندھے منہ گرنے کے خطرے میں ہوں گے اور اس قسم کے یکہ پر سوار ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا گویا آپ کی ران سواری میں آسٹریلیا کا مشہور جانور کانگرو ہے جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی اور پچھلی بڑی ہوتی ہیں جب تک آپ اس قسم کے یکہ پر سوار رہیں گے آپ کو بار بار یہ شبہ ہوگا کہ شاید موسم گرما گزارنے کے بعد پہاڑ سے اتر رہے ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ یہ قسم پہلی قسم سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اس میں تو صرف یہی ہے کہ چاروں شانے چت گر پڑے اور بس' لیکن اس میں اول تو اوندھے منہ گر پڑتا ہے دوسرے گرنے کے بعد یکہ کے سوار ہونے اور گھوڑے کے روندنے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ جس کے بعد یکہ کا سفر عدم آباد کا سفر بن سکتا ہے لہٰذا اس قسم کے یکہ پر اس طرح بیٹھنے کی ضرورت ہے کہ گویا آپ محل کے شہ نشین میں مسند پر گاؤ کے سہارے بیٹھے پیچوان سے دل بہلا رہے ہیں واضح رہے کہ میں نے پیچوان کہا ہے کوچوان نہیں کہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کوچوان سے دل بہلانا شروع نہ کر دیں اور نہ بھی گرتے ہوں تو اوندھے منہ گر پڑیں۔ اس لئے کہ کوچوان عام طور پر یکے کے اگلے حصہ میں بیٹھتا ہے اور دباؤ یکہ کا اگلا حصہ بس یہ سمجھ لیجئے کہ توپ کے منہ پر فضاؤں میں یکا یک بگڑ جانے والے ہوائی جہاز سے کسی طرح کم خطرناک نہیں ہوتا لہٰذا کیا ضرورت ہے کہ یکہ والے سے پینگ بڑھا کر ملک الموت سے تعلقات پیدا کئے جائیں "بار سواری نتوانست کشید" کا عذر لنگ کر کے آرام لینے کے لئے بیٹھ نہ جائے اور آپ اس کو بیٹھا دیکھ کر سڑک پر لیٹ نہ جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ یکہ پر بیٹھا ہوا آدمی اور پاڑ پر چڑھا ہوا مزدور تقریبا ایک ہی حالت میں ہوتے ہیں کہ ذرا چوکے اور قبر تیار ہے مگر بعض مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ یکہ کی سواری سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا اور بدرجہ مجبوری اپنے کو موت کے سپرد کرنا پڑتا ہے مگر ان صورتوں میں یہ بھی تو آسان ہے کہ بجائے یکہ کے اس کے گھوڑے کی سواری لے لی جائے یا یکہ والے سے کہا جائے کہ بھائی

تکلیف تو ہوگی مگر ذرا تم خود بجائے گھوڑے کے یکہ کو کھینچ کر ہم کو پہنچا دو تمہارا فرض اگر گھوڑا نہ پورا کر سکے گا تو ہم ادا کر دیں گے چاہے دو چار پیسہ زیادہ لے لینا' حالانکہ یہ بات ابھی تو ناممکن سی معلوم ہوتی ہے لیکن جب دستور ہی یہ ہو جائے گا کہ یکہ والے ہی یکہ کو کھینچا کریں تو اس وقت یقیناً موت کے امکانات محدود ہو جائیں گے اور یہ بات بھی کوئی نئی نہ رہے گی آخر رکشا بھی انسانی شکل وصورت کے گھوڑے کھینچتے ہیں وہی صورت یکوں کی بھی سہی۔

اول تو یکہ اب تک ہندوستان میں رائج رہنا دامن ہندوستان پر بدنما داغ ہے اور اس فرسودگی بلکہ چھکڑے پن کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہیے لیکن اگر ہندوستانیوں کو یہ سواری ایسی ہی عزیز ہے کہ وہ اپنے باوا آدم کی سواری کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو کم از کم یہ تو کریں کہ پہلے اپنی اپنی زندگیوں کا بیمہ کرا لیں تاکہ ان کے یکہ پر بیٹھنے کے بعد ان کی اولاد فاقوں نہ مرے اور اگر وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرائے بغیر یکہ پر سوار ہوں تو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے کہ فوج میں نوکری کریں اور ناگہانی موت مرنے کے بجائے سینہ پر گولی کھا کر مریں یا رود بار انگلستان کو پیراکی سیکھے بغیر عبور کرنے کی کوشش میں شہادت کا درجہ حاصل کریں تاکہ دنیا میں نام بھی ہو اور مچھلیوں کا پیٹ بھی بھرے۔ اس میں شک نہیں کہ یکہ نے زمانہ کے ساتھ کافی ترقی کی ہے اور وہ بھی ربڑ ٹائر وغیرہ ہو گیا ہے لیکن یکہ پھر بھی یکہ ہوتا ہے جس کا کام ہے سواریوں کو یعنی یکہ نشینوں کو گرانا' زخمی کرنا بلکہ اکثر اوقات مار بھی ڈالنا اور یہ نقص براہ راست تعلق رکھتا ہے گھوڑے سے لہذا جب تک یکہ کی ساخت وہی ہے جس کو شکار کھیلنے کے مچان کے علاوہ اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا اور پھر اس میں گھوڑا بھی جوتا جاتا ہے اس وقت تک اس کی سواری خطرہ سے خالی نہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری سواریوں میں گھوڑے کا جوتا جانا کیوں خطرناک نہیں ہے' اور یکہ میں جوتا جانا کیوں خطرناک ہے اس کا جواب اگرچہ تشریح طلب ہے مگر مختصراً عرض ہے کہ چارپائی میں گھوڑے کو جوتنا اور یکہ میں گھوڑا لگانا تقریباً یکساں ہے دوسری سواریوں میں تو یہ ہے کہ گھوڑے کے گرنے یا سواری کے الٹنے کے بعد اس میں بیٹھا ہوا آدمی اسی کے اندر گرے گا اور تھوڑا بہت زخمی ہونے کے علاوہ بخیریت رہے گا بلکہ یکہ کے الٹنے یا یکہ کے گھوڑے کے گرنے کے بعد یکہ نشین کو ہمیشہ سڑک پر یکہ اور ممکن ہے کہ یکہ پر گھوڑا بھی ہو' مختصر یہ کہ یہ گرنا ایسا ہوتا ہے اگر بچ گئے تو سمجھئے کہ پھر سے پیدا ہوئے' ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون بڑے اچھے آدمی تھے مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ؟

تو جناب مختصر یہ ہے کہ مہذب ممالک کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہاں دوا کے طور پر آنکھوں میں لگانے کے لئے بھی یکہ نہیں ملتا اور ہندوستان کی پستی کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ یہاں اب تک بڑے بڑے شہروں میں یکے چلتے ہیں اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ زمانہ یکہ کا زمانہ نہیں ہے یہ تو اس وقت کی چیز تھی جب شاہان مغلیہ میں سے کسی کے پاس معمولی سی فورڈ کار تک نہ تھی اور ان کے موٹر

بیل ہوا کرتے تھے لیکن اب تو لوگ ہوائی جہاز خریدنے کی فکر میں ہیں اور موٹروں کی کثرت نے گھوڑے اور گدھے کو برابر کر دیا ہے کہ جس طرح گدھا ٔران سواری میں رکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے اسی طرح گھوڑا رکھنا حماقت ہے، چہ جائیکہ گھوڑا مع ایک عدد یکہ ہو۔

◆◆◆

سودیشی عدالت

‘‘سوراج میں وکیل مفت ملا کریں گے’’ یہ ہمارا قیاس نہیں بلکہ کانگریس کے صدر بردولی سردار ولب بھائی پٹیل کا بیان ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوراجی عدالتیں کیسی ہوں گی صدر کانگریس کے اس بروقت اعلان نے ہمارے خیالات کو تقویت پہنچائی اور ہمارے ذہن میں جو رہے سہے شکوک تھے وہ بھی رفع ہو گئے ورنہ ہم پہلے ہی سے سوراجی عدالتوں کا تصور کئے بیٹھے ہیں اور ہمارے پیش نظر ابھی سے وہ منظر ہے جو سوراج ملنے کے بعد نظر آنے والا ہے قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک دن ہمارے دوست جو پہلے رامجس تھے اور اب مہاشے رامجس جی مہراج ہیں ہم سے خواہ مخواہ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے احاطہ میں الجھ پڑے کہ ‘‘اجی لاحول ولا قوۃ انگریزی عدالتوں میں آنا بھی کس قدر تکلیف دہ ہے کہ اٹھنے کی جگہ نہ بیٹھنے کی جگہ‘ گواہی دینے کیا آئے ہیں کہ گویا کسی عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں‘ ابھی کوئی انگریز گواہ آتا پھر آپ دیکھتے کہ کیا ہوتا مگر ہم تو ہیں غلام‘ لہٰذا غلام گردش میں پڑے ہوئے ہیں’’ عرض کیا کہ مہاشے جی یہ آپ نے کیا فرمایا کہ انگریزی عدالت میں آنا تکلیف دہ ہے؟ کہنے لگے اور نہیں تو کیا یہ انگریزی ہی عدالت تو ہے جہاں کوئی ہم کو ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا’’ عرض کیا ‘‘کہ انگریزی عدالت نہ ہوتی تو کیا کوئی بہتر انتظام ہوتا؟’’ اپنے چہرہ کو سوالیہ نشان بنا کر کہنے لگے کہ ‘‘کیا آپ سوراجی عدالت کے اس سے بہتر ہونے میں کوئی شک بھی کرتے ہیں؟’’ عرض کیا ‘‘شک نہیں بلکہ مجھ کو یقین ہے کہ اول تو انشاء اللہ سوراج میں عدالت ہی نہ ہو گی اور اگر ہوئی بھی تو عدالت کاہے کو ہو گی بھانڈوں کی نقل ہو گی’’ بڑی زور سے ڈانٹ کر فرمایا ‘‘کیا بکتے ہو‘ بھانڈوں کی نقل ہو گی‘ تم لوگ تو بس اس قابل ہو کہ تم کو خوب ذلیل کیا جائے‘ بات یہ ہے کہ غلامی کرتے کرتے دماغوں میں بس یہ سما گئی ہے کہ خود ہم تو کسی قابل ہیں ہی نہیں جو کچھ ہیں صاحب ہیں اور انہوں نے جو گت ہماری بنا رکھی ہے وہی ہمارے لئے بہت ہے’’ عرض کیا کہ سچ کہتے ہو‘ مہاشہ جی لیکن قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہم غلام رہتے رہتے واقعی غلام ہو کر رہ گئے ہیں اور ایک دم سے آقا نہیں بن سکتے۔ اگر اتفاق سے آقا بنا بھی دیئے جائیں تو آقا ہونے کے باوجود اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھ سکتے اس کے لئے ایک زمانہ چاہیے کہ ہم آقا بن کر خاندان غلاماں کے نہ معلوم ہوں‘ کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ جب ہم کو سوراج ملے گا تو ہم سب سے پہلے اس ذمہ داری کو گڑیوں کے کھیل کی طرح قبول کریں گے اور اس اہم ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد ذمہ دارانہ کاموں کو اس طرح انجام دیں گے گویا کسی ہندوستانی تھیٹر میں کامک کر رہے ہیں ابھی ہم اتنے اہل نہیں ہوئے ہیں کہ

حکومت کے نظم ونسق کے معیار کو موجودہ معیار کے مطابق رکھ سکیں۔ نہایت حقارت کے ساتھ منہ چڑانے کے انداز میں کہنے لگے ''اجی جانے بھی دو' لے کے چلے وہاں سے نظم ونسق نظم ونسق کو کیا لے کر چاٹیں گے' اور ہم اس قابل ہو ہی کیسے سکتے ہیں جب ہم کو غلام بنا کر رکھا گیا ہے اور اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی بنے رہیں گے'' عرض کیا۔ ''یہ ٹھیک ہے لیکن آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ ہم پہلے سے زیادہ اب قابل ہوئے ہیں یا نہیں' اسی طرح تھوڑے دنوں میں ہم اور بھی زیادہ قابل ہو کر اپنے ملک کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے لیکن ابھی نیم قابل ہونے کی صورت میں ہمارا بے لگام ہو جانا وہی بے ڈھنگے اور مضحکہ خیز نتائج پیدا کرے گا جس کو میں بھانڈوں کی نقل اور ہندوستانی تھیٹر کا کامک کہتا ہوں۔ عاجز آ کر کہنے لگے۔ تو تم چاہتے ہو کہ یہی ذلتیں رہیں' یہ خواریاں رہیں کہ کچہری میں گواہی دینے آئے ہیں اور ملزموں کی طرح خدائی خوار منہ اٹھائے پھر رہے ہیں' عرض کیا کہ ''ملزم تو خیر خدائی خوار نہیں پھرتے وہ تو نہایت آرام سے ہتھکڑیاں پہنے ہوئے بیٹھے ہیں' البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ انگریزی عدالت میں آپ کو غصہ آ رہا ہے آپ تضیع اوقات سے تنگ آ رہے ہیں آپ کو تکلیف ہو رہی ہے لیکن آپ حاضر عدالت رہنے پر مجبور ہیں اور اگر کہیں سوراجی عدالت ہوتی تو آپ کب کے ''ایسی تیسی میں جائے'' کہہ کر گھر روانہ ہو گئے ہوتے اور کانگریسی رضا کار آپ کو ڈھونڈھ رہے ہوتے'' کہنے لگے'' تو پھر'' عرض کیا تو پھر کیا اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ یہ عدالت ہے یا وہ ہوتی'' ہم کو بیوقوف بنانے کے انداز سے کہنے لگے'' عجیب آدمی ہو تم بھی یعنی خود ہی تم نے سوراجی عدالت کو آرام دہ ثابت کیا ہے اور خود ہی پوچھتے ہو' یہ عدالت ہے یا وہ ہوتی'' عرض کیا ہے کہ ''یہ تو صحیح ہے لیکن وہ عدالت نہیں ہوئی وہ ہوا خالہ جی کا گھر اور یہ خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہ ٹھہری عدالت'' کہنے لگے'' تم بالکل غلام ہو عرض کیا'' درست ہے'' کہنے لگے اپنی عدالت کے ہم خود مالک ہوں گے اور عدالت ہماری ہوگی ہم کو اختیار ہوگا کہ جو چاہیں کریں ہم حاکم وقت ہوں گے ہمارا راج ہوگا ہم کسی کے غلام تو نہیں ہوں گے کہ ذرا سی گواہی کے لئے سارے سارے دن بیگار میں پکڑے بیٹھے رہیں' جیسے کسی کے باپ کے نوکر ہیں۔'' عرض کیا کہ مہاشے جی بالکل ٹھیک کہتے ہو ہم نے بھی سوراجی عدالت کے لیے یہی رائے قائم کی ہے جو تم کہہ رہے ہو دیکھو میں تم کو ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ کر بتاتا ہوں کہ سوراجی عدالت کیسی ہوگی''

مہاشے جی ٹہلتے ٹہلتے درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور ہم نے اس کو اجازت سمجھ کر کہنا شروع کیا ہوگا یہ کہ زیادہ تر مقدمات سودیشی کے جھگڑے میں قائم ہوا کریں گے کہنے لگے'' یہ کیا؟'' عرض کیا ''بس آپ سنتے جائیں میں سب بتا دوں گا اول تو سوراجی راج میں سب سے بڑا جرم بدیشی اشیا کا فروخت کرنا ہوگا اور پھر دوسرے نمبر کا جرم ان غیر ملکی اشیا کو خریدنا ہوگا فرض کیجئے کہ کانگریسی رضا کار کسی کو بدیشی کپڑا فروخت کرتے ار کسی کو بدیشی کپڑا خریدتے دیکھیں گے تو وہ فوراً دو چار کی تعداد میں ایک قومی جھنڈا لے کر جو

اس وقت حکومت کا جھنڈا ہوگا موقع واردات پر پہنچ جائیں گے اور دکاندار اور گاہک دونوں کو ملزم نمبر ایک اور ملزم نمبر دو بنا کر سوت کی بٹی ہوئی موٹی سی رسی میں باندھ لیں گے اور ''بدیشی کپڑا بیچنا حرام ہے' بدیشی کپڑا خریدنا حرام ہے'' کہتے ہوئے ان دونوں بدنصیب ''حرامکاروں'' کو بھرے بازار سے گھماتے ہوئے کانگریس کے مقامی دفتر میں پہنچیں گے جس کو آپ چاہے تھانہ کہیے چاہے عدالت یہاں پہنچ کر ان بے چاروں کو کھڑا کر دیا جائے گا اور رضا کار فرش پر نہایت اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھ جائیں گے اور وہ منشی جی نما حاکم وقت جو گاؤ تکیہ کے سہارے ڈیکس پر بہی کھاتا کھولے ہوئے بیٹھے ہوں گے دریافت کریں گے'' ''کہو کیا قصہ ہے؟'' اس وقت چپکے سے گلی میں گئے اور ان دوسرے میاں صاحب کی دکان پر کچھ کپڑا خریدا' ہم بھلا کب چوکنے والے تھے ہم فوراً تاڑ گئے کہ مال بدیشی ہے اور ہم نے سیتارام سے کہا کہ دو تین والنٹیر وں کو بلا لو تو ہم ابھی دونوں کو دھرے لیتے ہیں' سیتارام دو اور آدمیوں کو بلا لائے اور ہم نے ان کو گرفتار کر لیا ہے ان کے پاس یہ بدیشی کپڑا ہے جو انہوں نے خریدا ہے اور انہوں نے بیچا ہے۔''

حاکم عدالت یعنی پنڈت جی اپنے رضا کار کا بیان سن کر فوراً حکم سنائیں گے نہ وکیل کی ضرورت نہ گواہ کی نہ جرح کی حاجت نہ صفائی کی بحث کا جھگڑا نہ پیشی بڑھانے کا بکھیڑا' بس وہ فوراً کہیں گے کہ یہ ''کپڑا لے کر تو ابھی ہولی جلا دو اور جنہوں نے کپڑا خریدا ہے ان کے دام ضبط بلکہ ان سے کہو کہ ابھی جا کر سودیشی بھنڈار سے اس کی دگنی رقم کا کھدر خریدیں' یہ ان پر جرمانہ ہے اور بیچنے والے کی دکان کی تلاشی لے کر سب بدیشی مال برآمد کرو جو جلسہ کے دن ہونے والی ہولی میں جلایا جائے گا اور ان پر ایک سو ایک روپیہ جرمانہ' اس جرمانے میں اکاون روپیہ تو کانگریس فنڈ کے ہوئے باقی رہے پچاس' اس میں سے پچیس ہمارے اور پچیس میں تم سب'' اس حکم کے بعد رضا کار عذر پیش کرے گا کہ ''واہ پنڈت جی سب کیا دھرا تو ہمارا ہے اور تم کہتے ہو کہ پچیس روپیہ میں سب'' پنڈت جی قائل ہو کر حکم دیں گے کہ ''نہیں دس روپے تمہارے اور باقی پندرہ روپے میں یہ تین'' اس قسم کی ہوگی وہ عدالت جن پر جناب کو ابھی سے ناز ہے اور اس وقت آپ کی گردن نیچی ہوگی'' مہاشہ جی بڑے غور کے ساتھ سنتے رہے اور جب نتیجہ پر پہنچ کر ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تمام نقشہ شروع سے آخر تک مضحکہ خیز تھا تو ترشروئی کے ساتھ کہنے لگے'' ''دل لگی کرتے ہو تم مذاق اڑاتے ہو' بیوقوف بناتے ہو' لیکن ابھی ہنس لو اس وقت تم خود دیکھو گے کہ کیا ہوتا ہے پھر اس مذاق اڑانے کا پتہ چلے گا' عرض کیا'' ''گستاخی معاف کیا خاکسار نے کوئی غلط بات عرض کی ہے'' کہنے لگے اور نہیں تو کیا سچ ہے'' ''عرض کیا اب قبل از وقت میں کیوں کر ثابت کر سکتا ہوں کہ میں نے جو خاکہ کھینچا ہے وہ مذاق نہیں بلکہ وہی تخیل ہے جو سوراجی مستقبل کے متعلق میرے ذہن میں موجود ہے۔ اب وہ خود مضحکہ خیز ہو تو دوسری بات ہے لیکن میں نے تو سنجیدگی کے ساتھ یہی رائے قائم کی ہے۔'' کہنے لگے'' تمہارے ذہن میں تو بھرا ہا ہے کوڑا میں تم کو بتاتا ہوں کہ ہماری اپنی

عدالت کیسی ہوگی سنو' ہماری عدالت میں سب سودیشی ہوگا' فرنیچر سے لے کر حاکم تک اور حاکم سے لے کر چپراسی تک کوئی بدیشی نہ ہوگا البتہ اگر ضرورت ہوگی تو جس طرح آج کل ہندوستانی چپراسی رکھے جاتے ہیں اور اور انگریز حاکم اسی طرح اس وقت ہندوستانی حاکم ہوں گے اور انگریز چپراسی' حاکم اور کلرک وکیل اور بیرسٹر چپراسی اور سپاہی' پیشکار اور اہلمد' مدعی اور مدعا علیہ' گواہ اور تماشائی سب کھدر پہنے ہوئے ہوں گے۔ زبان وہی ہوگی جس کو برج بھاشا کہتے ہیں اور انگریزی بولنے والا عدالت سے نکال دیا جائے گا جس وقت سفید رنگ کے نورانی کھدر میں ملبوس چپل پہنے ہوئے حکم کمرہ عدالت میں آئے گا اس وقت کوئی نہ سمجھ سکے گا کہ یہ کون ہے لیکن فوراً ہی بندے ماترم' انقلاب زندہ باد' مہاتما گاندھی کی جے'' کے تین نعرے بلند ہوں گے اور حاکم اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرے گا اس وقت سب سمجھ جائیں گے کہ یہی حاکم ہے اور اس کو سب جگہ دے دیں گے اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائے گا اس کے بعد باقی تمام لوگ فرش پر آرام سے بیٹھ جائیں گے حاکم مقدمہ اس طرح شروع کرے گا جس طرح آج کل ہوتا ہے' البتہ نہ حاکم میں وہ فرعونیت ہوگی جو آج کل حکام میں ہوتی ہے اور نہ وکیلوں کے وہ نخرے ہوں گے جو آج کل کے وکیل کرتے ہیں' بات یہ ہے کہ حاکم کی تنخواہ آج کل کے حاکموں کی تنخواہوں کی طرح غریبوں کا پیٹ کاٹ کر ہزار ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار نہ ہوگی اس لیے کہ خود وائسرائے کی تنخواہ پانچ سو ہوگی اس حساب سے حاکم عدالت بھی دس روپے سے لے کر پچاس روپے تک کی تنخواہ کے ہوا کریں گے ان بیچاروں میں وہ ریاست اور غرور ہو ہی نہیں سکتا جو ان بڑی بڑی تنخواہ پانے والوں میں ہوتا ہے اور جب ان میں غرور نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ نہ وکیلوں میں نخرے ہوں گے نہ پیش کاروں کے دماغ آسمان پر ہوں گے نہ اہلمدوں کی خدائی ہوگی' سب بیچارے سیدھے سادے ہوں گے ہاں تو جس وقت مقدمہ شروع ہوگا اس وقت سب سے پہلے حلف لیا جائے گا اور حلف لینے کا طریقہ یہ ہوگا کہ پیشکار یا کوئی چپراسی ایک چھوٹا سا کھدر کا جھنڈا بیان دینے والے کو دے گا اور بیان دینے والا اس کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائے گا کہ میں اس سبز سفید اور سرخ قومی جھنڈے کو ہاتھ میں لے کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اس کے بعد وہ نام عمر باپ کا نام اور پیشہ وغیرہ بتا کر اپنا بیان شروع کرے گا اس پر فریق ثانی کا وکیل جرح کرے گا اور باقی تمام کارروائی اسی طرح عمل میں آئے گی جس طرح آج کل ہوتی ہے لیکن عدالت جس وقت فیصلہ سنائے گی وہ آج کل کے فیصلہ سے ذرا مختلف ہوگا یعنی یہ کہ اگر کسی کو سزا دینا ہے تو سزا جیل وغیرہ کی نہ ہوگی اس لئے کہ جیل کی سزا غلاموں کو دی جاتی ہے آزادوں کو نہیں دی جائے گی۔

مثلاً تا برخاست عدالت خرچہ کاتو یا کانگریس میں جو چندہ دیتے ہو وہ ایک سال کے لئے یا ہمیشہ کے لئے دوگنا کر دو یا پھوک ہڑتال کر دو یا چھ مہینے تک کھدر بنو یا سال بھر تک نمک بناؤ وغیرہ اگر ان سزاؤں کو ملزم نے تسلیم کر لیا تو خیر ورنہ اس سے بڑی عدالتوں

میں اپیل کرسکے گا یہاں تک کہ اس کا مقدمہ بعدالت مہاتما گاندھی بھی پیش ہوسکے گا اور وہاں سے جو اس کو سزا دی جائے گی وہ قطعی ہو گی ہاں اگر چھوٹی ہی عدالتوں میں معاملہ رفع دفع ہوگیا تو پھر کوئی بات نہیں ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ ہمارے سوراجی راج میں جیل خانوں کی مدہی نہ ہوگی اور پھانسی تو بالکل نہ ہوگی اب یہ سوال ہوسکتا ہے کہ پھر خون کرنے والوں کو کیا سزا دی جائے گی اس کے متعلق یہ ہوگا کہ قاتلوں کو زندگی بھر بھوک کی ہڑتال کرنے کی سزا دی جائے گی اور وہ اس غیر متشدد موت سے خود ہی اپنے وقت پر مرجائیں گے بہرحال حکومت اپنے حکم سے موت کی سزا نہ دے گی بلکہ ان کو قتل کرنے کے باوجود مرنے کے لئے آزاد رہنے دیا جائے گا یہ نہیں کہ ان کو بیرحمی کے ساتھ لٹکا دیا جائے اور وہ پھانسی کے پھندے میں اپنی جان دیں اسی طرح وہ سزائیں جو آج کل بعبور دریائے شور کہلاتی ہیں اس وقت تبدیل ہوکر ''شور سازی کی صورت اختیار کرلیں گی اور ان کے ملزموں کو سمندر کے کنارے بھیج دیا جائے گا کہ وہ تمام عمر وہیں رہیں اور نمک بنا کر زندگی بسر کریں اول تو سوراجی راج میں اس قسم کے جرائم ہی نہ ہوں گے ہر طرف شانتی اور عدم تشدد کا دور دورہ ہوگا لیکن قانون پھر بھی قانون رہے گا اور قانون کی نظر میں ان تمام باتوں کا ہونا ضروری ہوگا خواہ وہ عمل میں آئیں یا نہ آئیں یہ ہوگی وہ عدالت اور یہ ہوگا وہ انصاف جس کو تمہاری غلامانہ ذہنیت سمجھ ہی نہیں سکتی۔ مہاشہ جی کی اس مفصل نہرو رپورٹ کو بغور سنا اور اعتراف کے انداز میں عرض کیا ''واہ مہاشہ جی کیا بات ہے' واللہ وہ سکیم پیش کی ہے جو ہمارے تو کیا ہمارے فرشتوں کے بھی ذہن میں نہیں آسکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ تم کانگریسی حلقہ سے بہت سے زیادہ قریب ہو اور قریب کیا ہو بلکہ خود ہی اس حلقہ میں ہو اور ہم اس سے بہت دور' لہٰذا جو تم سمجھ سکتے ہو ہم نہیں سمجھ سکتے'' فخریہ انداز میں فرمانے لگے۔ ''تو پھر تم خواہ مخواہ دخل در معقولات کیوں کررہے تھے' بھائی یہ تو معمولی سی بات ہے کہ جس سوراج کو حاصل کرنے کے لئے مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو' سردار ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت مدن موہن مالوی ایسے بیرسٹر کوشش کررہے ہیں اس کی عدالتوں میں کوئی نقص ہوسکتا ہے؟ تمام دنیا کی عدالتیں تو خود یہ لوگ چاٹے بیٹھے ہیں' ان کو کوئی کیا سکھائے گا کہ یہ نہیں وہ''

ہم نے طالب علمانہ انداز سے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہوئے عرض کیا ''مگر مہاشہ جی یہ عدالتوں وغیرہ کا خرچ کہاں سے نکلے گا مثلاً حاکم عدالت اور عملہ عدالت کی تنخواہیں اور دوسرے مصاوف وغیرہ۔ ایک متبحر عالم کی طرح کہنے لگے۔ ''ارے میاں وہ تو عدالت کی آمدنی ہی سے سب پورا ہوجائے گا آخر یہ جو جرمانے ہوں گے کہاں جائیں گے یہ جو سٹامپ وغیرہ کی قیمتیں ہوں گی ان سے کوئی سرکاری خزانہ بھرنا تو مقصود ہوگا نہیں' بس یہ ہوگا کہ جو مہینہ بھر کی آمدنی ہوئی اس میں سے خرچ نکال لیا جائے گا باقی منافع اگر بچے گا تو کانگریس فنڈ میں ڈال دیا جائے گا اور وہ بھی سب ہم ہی لوگوں کے کام آئے گا'' عرض کیا'' مگر سنئے تو سہی کہ جب سوراج مل جائے گا تو پھر کانگریس کی کیا ضرورت باقی رہے گی جو وہ قائم رہے گی اور جب وہ قائم نہ رہے گی تو اس کا فنڈ کیسا'' تجربہ کارانہ تیور سے فرمایا'' واہ یہ بھی ایک ہی رہی کہ کانگریس سوراج کے بعد توڑ دی جائے گی ارے بھائی کانگریس تو اب سے لے کر قیامت تک رہے گی بلکہ

شاید اس کے بعد بھی رہے۔ جب انگریزوں کی حکومت اس کو ہٹا نہ سکی تو سوراج ملنے کے بعد کیا ہم خود اپنے پیر پر کلہاڑی ماریں گے؟ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا بلکہ سوراجی راج دراصل کانگریسی راج ہوگا اور کیوں نہ ہو، کانگریس ہی کے بل بوتے پر تو سوراج ملے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کانگریس باقی نہ رہے گی تو ممکن ہے کہ سوراجی راج بھی بغیر کسی تنبیہ الغافلین جمعیت کے انگریزی راج بن جائے اور سارا کیا کرایا برباد ہو جائے۔ ہم نے کہا ٹھیک کہتے ہو مہاشہ جی مگر یہ تو بتاؤ کہ

”راجمس گواہ حاضر ہے، راجمس گواہ حاضر ہے، راجمس“

اس آواز نے احاطہ عدالت میں گونج کر سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ مہاشہ جی گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور ”پکار“ ہو گئی کہتے ہوئے بھاگے لیکن بھاگتے ہی پھر کچھ خیال آ گیا اور ہماری طرف جھپٹے کہ ”لو بھائی یہ میری گاندھی ٹوپی تم پہن لو اور اپنی ترکی ٹوپی مجھ کو دے دو، شاید گاندھی ٹوپی دیکھ کر صاحب برا مان جائیں، ہم نے بغیر کسی پس و پیش کے ٹوپی بدل لی، اس لئے کہ تھوڑے دنوں کے بعد ممکن ہے کہ سوراجی حکومت میں ہم کو بھی سودیشی عدالت میں حاضر ہوتے ہوئے ترکی ٹوپی سے مہاشہ جی کی گاندھی ٹوپی بدلنا پڑے۔

◆◆◆

گومتی سے جمنا میں

خدا جانے مجھ کو سفر کی ضرورت تھی یا سفر کو میری' بہر حال دونوں میں سے ایک بات برحق تھی اس لئے کہ میں نے خود اپنے کو بقائمی ہوش وحواس سفر میں دیکھا۔ 10 نومبر 1930ء کی صبح کو بیدار ہونے کے بعد بھی میرے تخیلات میں وہی دو پہیوں والی بائیسکل تھی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ بیداری کے اس خواب کی تعبیر ریل گاڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہوا یہی کہ ٹھیک گیارہ بجے مجھ کو اطلاع دی گئی کہ میں رات کی گاڑی سے سفر کروں گا ظاہر ہے کہ اس میں میرے ارادے کو دخل نہ تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بہت سی باتیں غیر ارادی طور پر ہوا کرتی ہیں اور انہی میں سے میرے نزدیک یہ سفر بھی ہے گیارہ بجے کے بعد سے تمام دن دفتر روزنامہ ''اودھ اخبار'' کی کرسی پر گزرا لیکن ایسا ہونے کے باوجود مجھ کو تمام دن یہ محسوس ہوتا رہا کہ گویا میری کرسی ترقی کے منازل طے کر کے ریل گاڑی بن گئی ہے اور میں نے وہی سفر شروع کر دیا ہے جو میں شروع کرنے والا تھا اس عالم کا نام ہے' سفر کا سوار ہونا اور یہی عالم مجھ پر اس وقت تک طاری رہا جب تک میں نے اپنے دن بھر کے تصور کو جاندار نہیں دیکھا لیکن اس کے بعد گویا مجھ پر وہ تمام کیفیت خود گزر رہی تھی جس پر دن بھر میں گزر چکا تھا۔

چار باغ سٹیشن سے میرا سفر شروع ہونے والا تھا لہٰذا لکھنو کے اس عظیم الشان تاج محل ''سٹیشن پر رات کو 9 بجے میں اور میرے رفیق سفر جن میں سے تین شاعر اور ایک شاعر نواز' دو ہولڈال اور تین سوٹ کیس تھے پہنچ گئے اور تیسرے درجہ کے اس ڈبہ میں جگہ پائی جو اب تک ''دیسی صاحب بہادروں'' کے لئے مخصوص تھا لیکن اب اسمبلی نے اس خصوصیت کو مٹا دیا ہے۔ البتہ جی آئی پی' ریلوے ابھی تک اس ''اینگلو انڈین پن'' سے باز نہیں آئی۔ اس ڈبے میں بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے لیکن دل بار بار یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سر کی ترکی ٹوپی ہیٹ بن جائے اور شیروانی ایک ایسا کوٹ جو پاجامے کو بھی پتلون بنا دیا کرتا ہے اس لئے کہ اس جسارت کے بعد یہ خوف تو بہر حال دل میں موجود تھا کہ کہیں اس تھرڈ کلاس کی جنت سے ہم کو ابن آدم سمجھ کر نکال نہ دیا جائے' یہ تو بہت آسان تھا کہ ہم وقتی طور پر بجائے مسلمان ہونے کے عیسائی بن جاتے لیکن اس لباس کا کوئی علاج ہمارے ذہن میں نہ تھا جو کبھی مذہب تبدیل نہیں کرتا' ہمارا خوف بیجا نہ تھا اور بیجا کس طرح ہوتا جبکہ ہم خود حق بجانب نہ تھے نہ تو ہم اینگلو انڈین تھے نہ صرف ''اینگلو'' بلکہ محض ''انڈین'' تھے لہٰذا حق بجانب بھی نہیں ہو سکتے تھے تھوڑی ہی دیر کے بعد گارڈ نے ہم کو نکل جانے کا حکم دیا جس کو ہم نے اس طرح سنا

گویا سمجھے نہیں اور وہ سمجھا کہ ہم سمجھ گئے مگر گاڑی کی روانگی سے دو منٹ قبل ہم کو پھر اردو زبان میں نکل جانے کے متعلق سمجھایا گیا جس کو ہم نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گارڈ صاحب نے بہت سے کرو مین ہم پر تعینات کئے کہ وہ ہم کو نکال دیں، لیکن ہم نے اسمبلی کے تمام واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایسی مدلل بحث کی کہ گاڑی نے سیٹی دے دی اس آخری وقت میں گارڈ صاحب کے دل میں تو نہیں معلوم کہ کونسا انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہوگا لیکن انہوں نے کیا صرف وہ جو ہم لوگ خود اپنے بچپن میں کیا کرتے تھے یعنی ڈبہ میں داخل ہو کر روشنی گل کر دی اس ادا پر بہت سے سطحی مسافروں کو تو غصہ آیا ہوگا لیکن میرے منہ سے نکل گیا۔

تو مشق ناز کر سارا اندھیرا میرے ڈبے میں

گاڑی چھوٹ چکی تھی ڈبے میں اندھیرا تھا اور سب خاموش کہ ایک مجاہد نما مسافر نے بڑھ کر روشنی جلا دی اور گارڈ کی بربریت پر دانت پیس پیس کر تبصرہ کرنے لگا۔ ہم سب نے اس تبصرہ کو اس حد تک سنا کہ آخر یہ طے پا گیا کہ کانپور پہنچ کر اس وحشیانہ سلوک کی شکایت کی جائے گی، چنانچہ یہی ہوا کہ کانپور میں سب سے پہلے ہماری شکایت سٹیشن ماسٹر کے دفتر میں داخل دفتر ہوگئی۔

لاحول ولاقوۃ...... اب تک یہ بھی نہ بتایا کہ آخر ہم کس تقریب سے اور کہاں جا رہے تھے۔ تقریب کے متعلق ہم کو خود کوئی علم نہیں اس لئے کہ اگر تقریب تھی بھی تو ہماری نہ تھی لیکن کہاں جا رہے تھے کے متعلق آپ یہ سمجھ لیجئے کہ ہر اس جگہ جہاں لے جائے جائیں اور اس وقت ٹکٹ صرف اٹاوہ تک کا تھا جہاں کہ گاڑی کانپور ویٹنگ روم میں پڑے رہنے پر ملتی ہے اور جو اپنی قسم کا درہ خیبر ہے کہ لمبان نسبتاً چوڑان سے اس قدر کم ہے کہ گویا بس لمبان ہی لمبان ہے اور وہ بھی ایک طرف پلیٹ فارم اور دوسری طرف سڑک کے حائل ہو جانے سے اس قدر موزوں حدود میں رہ گئی ہے کہ اگر نہ رہتی تو اچھا تھا۔ ایسے ویٹنگ روم میں ٹھہرنا اور ٹھہر کر آرام کرنا ممکن ہے کہ کسی قسم کی مخلوق کے بس میں ہو لیکن ہمارے بس کی بات نہ تھی، آرام کرنا اور نہ کرنا تو خیر دوسری چیز ہے لیکن وقت گزاری تو بہر حال ضروری تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنا ویٹنگ روم اپنی جماعت کے قائداعظم کو سمجھا جن کا شریک سفر ہونا ہی ویٹنگ روم کے آرام سے کہیں زیادہ تھا ہم نے اپنا اسباب دوسرے مسافروں کے اسباب کے پاس رکھ دیا اور خود اس اسباب پر بیٹھ گئے کوئی گنگنا رہا تھا کوئی اونگھ رہا تھا، کوئی ٹہل رہا تھا لیکن ہمارے قائداعظم کو معلوم تھا کہ وہ ہماری جماعت کے رہنما ہیں، اور ان کا کیا فرض ہے ان کے علاوہ خود ان کے معدہ میں وہی تکلیف پیدا ہو چکی تھی جس کو اصطلاح عام میں بھوک کہتے ہیں اور ان کا دماغ اس تکلیف کو دور کرنے کی فکر میں مصروف تھا یکایک ہم سب نے اپنے قائداعظم کو ویٹنگ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا اور جب ہم سب ان کے پیچھے دوڑے تو معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب خدا نے کسی مسافر کے اسباب سے ہمارے لئے شیرینی کا انتظام کیا ہے۔

ہمارے قائداعظم کے ہاتھ میں حلوہ سوہن تھا جو کسی مسافر کے سامان سے نکل کر کسی مسافر کے معدہ میں پناہ چاہتا تھا، حلوہ سوہن کے ذائقہ سے کہیں زیادہ اس نعمت کے غیبی طور پر حاصل ہو جانے سے لطف آ رہا تھا اور خود حلوہ سوہن بھی ایسا تھا کہ سبحان اللہ کانپور میں دہلی اور آگرہ کا مزہ آ گیا۔ معلوم نہیں خریدنے والے نے کس جگہ اور کس حساب سے خریدا تھا، لیکن کھانے والے نے تو اس طرح کھایا گویا آسمان سے نازل ہو کر معدہ میں پہنچ گیا ہے خیر، ان باتوں سے کیا مطلب؟ ہم نے تو خدا کا شکرہ ادا کیا اور قائداعظم کو دعائیں دی۔ اس میں شک نہیں کہ صاحب حلوہ سوہن ”نے جوان کے ہاتھوں“ محروم حلوہ سوہن بن گیا تھا چرانے والے کو خوب ہی کوسا ہو گا لیکن باب اجابت پر پہنچ کر ہماری دعا اور اس کی بددعا کا تصادم جو نتیجہ برآمد کرے گا وہ کچھ نہیں ہو گا یعنی

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

حلوہ سوہن کھانے کو ملا اور بغیر کسی جانی یا مالی نقصان کے یہی کیا کم تھا اٹاوہ جانے والی گاڑی اس ”حلوہ سوہنی ہنگامہ“ کے بعد آ کر ہم کو لے گئی اور ہم سب ایک ڈبہ میں بیٹھ کر روانہ ہوئے جس میں بھانت بھانت کے انسانوں کے علاوہ ”بہر سو“ نہ سہی لیکن ”بیک سونگارے“ کا سامان موجود تھا۔ جس نے ہمارے شریک سفر حضرت امین سلونوی کو اس حد تک جذب کیا کہ ہم سب کی اجتماعی کشش ان کو اس سیٹ سے بہ مشکل ہٹا سکی جس پر راجپوتانہ کے شباب مگر معصوم حسن کا ایک نمونہ بطور نمونہ مع اپنے دکان دار کے موجود تھا۔ امین صاحب کے ہٹ جانے کے بعد وہ جوان راجپوتنی شیر کی کھال اوڑھ کر ایک مست شیرنی کی طرح اس انداز سے شباب کی نیند میں کھو گئی لیکن پھر بھی ہمارے امین صاحب کو ادھر دیکھنے کی جرات بھی نہ ہوئی کہ مبادا پنجہ مار دے لیکن پھر بھی ان کا دل یہی چاہتا تھا کہ میں راجپوت ہوتا بلکہ اگر وہ کسی راجپوت کی دھرم پتنی نہ ہو گئی ہوتی تو ہمارے لائق دوست اس کے پتی بن جانے کو امین سلونوی ہونے پر ترجیح دیتے، تمام راستہ ان کی یہی آرزو رہی کہ کسی طرح شیر کی کھال ہٹ جائے اور وہ نظر بھر کر اس شیرنی کو دیکھ لیں لیکن وائے ناکامی کہ اٹاوہ سے پہلے وہ کافر شیرنی والا جلوہ نظر نہ آیا اور اٹاوہ کے سٹیشن پر نظر بھی آیا تو اس طرح کہ وہ انگڑائی لے رہی تھی اور گاڑی چھوٹ کر تیز ہو گئی تھی لیکن اس کا تصور اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر امین صاحب کے دل میں یا دماغ میں جہاں بھی ہو بہر حال موجود تھا یا خود اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر ہونے کے باوجود ابھی تک اس گاڑی میں تھے جس سے اتر چکے تھے۔

اٹاوہ کے پلیٹ فارم پر اترنے کا مقصد اشفاق حسین صاحب بیخود اٹاوی سے ملنا تھا جس کا آدھی رات کو کوئی موقع نہ تھا یا اگر تھا تو خطرہ سے خالی نہ تھا لہٰذا ہم سب چپ ہو کر سو رہے اور اس وقت تک سوتے رہے جب تک ہمارے قائداعظم نے بستر پر پیا کانہ چڑھ آنے والے کتے کو نہایت صور نما آواز سے ڈانٹا نہیں جس سے کتا تو خیر بھاگ گیا لیکن ہم لوگ جو موت سے شرط باندھ کر سوئے

ہوئے تھے گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور بیخود صاحب کے یہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے تیاری میں کیا دیر لگتی ہے یہ سمجھئے کہ بیخود صاحب کے در دولت پر پہنچ گئے' بیخود صاحب علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ وکیل اور اٹاوہ کے رہنے والے شاعر ہیں مختصر یہ کہ شاعر بھی ہیں اور وکیل بھی خدا جانے کہ وکیل اچھے ہیں یا شاعر اچھے اس لئے کہ اب تک کسی مقدمہ میں ہم نے ان سے وکالت نامہ داخل نہیں کرایا ہے اور نہ کبھی ان کی کوئی بحث یا جرح سنی ہے' لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پہنچنے پر بیخود صاحب نے تعزیرات ہند بند کر کے بغیر اپنی بیاض کھولے ہوئے ہلکے ہلکے سروں میں اپنی چند غزلیں سنا دیں' جو خوب یاد تھیں اور غزلوں سے کہیں زیادہ ان کا وہ ترنم لطیف تھا جس کی لچک سے سننے والے ایک خاص لطف حاصل کر رہے تھے' بیخود صاحب کے بعد خاکسار ذرہ بے مقدار کمال صاحب حامدی او امین صاحب سلونوی نے اپنا کلام سنایا اور رخصت ہو کر بغیر چائے وغیرہ پئے ہوئے سٹیشن آ گئے جہاں مولڈال پر اپنے قائد اعظم کو اس لئے بٹھا گئے تھے کہ اسباب دیکھتے رہیں' بیخود صاحب نے ہم لوگوں کو رخصت کرنے سے قبل اٹاوہ کے مشاعرہ کی شرکت کے لئے دعوت نامے دیئے تھے جن کو ہم نے غلطی سے سٹیشن پہنچ کر بجنسہ لیٹر بس میں ڈال دیا افسوس ہے کہ وہ کارڈ بیخود صاحب کو بیرنگ واپس ملیں گے اور خواہ مخواہ چار پانچ آنے ان بیچارے کو دینا پڑیں گے۔

اٹاوہ سے ہم نے آگرہ کا ٹکٹ خریدا اور ''بسفر رفتند مبارک ہو'' ہو گئے ہمارا ڈبہ بالکل خالی تھا یعنی ہماری جماعت کے علاوہ وہ صرف ایک اور مسافر تھا جو بیچارہ اپنی ایک آنکھ لئے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھا گنگنا رہا تھا' ہم لوگ نہایت اطمینان سے بیٹھ گئے اور ہمارے قائد اعظم لیٹ گئے۔ سونے کے لئے تو ہم سب کا دل چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ سو کر سفر طے کرنا عمر عزیز کو خواب غفلت میں گزارنے سے بھی برا ہے ہم سب جاگتے رہے البتہ قائد اعظم نے خراٹے لینا شروع کر دیئے ایک طرف ان حضرات کے خراٹے اور دوسری طرف اس تنہا ایک چشم مسافر کا سامعہ خراش ترنم ریل کی چھک چھک پر غالب آ کر ہمارا دماغ اڑائے دیتا تھا نہ تو قائد اعظم کے خراٹوں پر دفعہ ایک سو چوالیس لگائی جا سکتی تھی اور نہ اس مسافر کی نغمہ سرائیوں کو خلاف قانون جماعت بنایا جا سکتا ہے عجیب مصیبت میں تھے میں نے مجبوراً اس مسافر سے کہا کہ آپ ادھر ذرا ہٹ کر بیٹھیں ''بولا کیوں؟'' عرض کیا کہ ''ہم سب ان سونے والے بزرگ کو آگرہ لئے جا رہے ہیں تین سال سے دماغ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے بات کرتے کرتے منہ نوچ لیا کرتے ہیں جس کسی کو دل چاہتا ہے اٹھا کر دے مارتے ہیں یا کسی کو کاٹ کھاتے ہیں اور کسی کو گالیاں دیتے ہیں مجبوراً ہم سب اپنے دل پر پتھر رکھ کر انہیں آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کرنے جا رہے ہیں آپ سے اس لئے کہہ دیا کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر بیٹھیں یہ سننا تھا کہ مسافر کی روح پرواز کر گئی چپکے سے اپنا بستر اٹھا کر پاخانہ کے قریب بیٹھ گیا' غالباً اس نے یہ طے کیا ہو گا کہ اگر پاگل نے حملہ کیا تو پاخانہ میں

گھس کر جان بچالوں گا اس کے جگہ منتقل کرتے ہی مفروضہ پاگل نے انگڑائی لی اور میں نے دوڑ کر سنبھالتے ہوئے کان میں تمام واقعہ کہہ دیا بس پھر کیا تھا وہ بڈھا پاگل اپنی سیاہ اور سفید منتشر داڑھی کو سرخ چہرے کے ساتھ لئے نہایت خوفناک طریقہ پر اٹھا اور بھیانک آواز میں پوچھا؟

''بھوپال کتنی دور ہے''

چونکہ رخ اسی سہمے ہوئے مسافر کی طرف تھا لہٰذا اس نے جواب دیا۔

''اب آتا ہے تھوڑی دور ہے آپ لیٹ جایئے۔''

مسافر کے جواب پر پاگل صاحب اسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس سے اس طرح گفتگو شروع کی کہ اس بیچارے کا خون بالکل منجمد ہو گیا وہ مجبور تھا کہ گاڑی چل رہی تھی ورنہ شاید وہ اس طرح سہم سہم کر کبھی جان نہ دیتا پاگل نے اس سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو اس نے جواب دیا ''برہمن'' یہ سننا تھا کہ پاگل نے فوراً اپنا لوٹا اٹھا کر اس سے پوچھا ''پانی پیو گے' اس نے لرزتے ہوئے جواب دیا' ''نہیں صاحب آپ تو سو جایئے'' پاگل نے کہا ''نہیں ضرور پیو'' اور یہ کہہ کر لوٹے کا تمام پانی اس پر چھوڑ دیا۔ وہ بیچارہ بھیگ جانے کے باوجود اس طرح خاموش بیٹھا تھا گویا اگر جان بخش دی جائے تو یہ سب کچھ منظور ہے لیکن یہاں تو اس کی روح قبض کی جا رہی تھی' ہمارے پاگل قائداعظم نے داڑھی پر متانت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا؟''

''ہم اچھے ہیں نا''

مسافر نے درباریوں کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر جواب دیا ہاں صاحب بالکل اچھے پاگل نے کہا ''مگر ہم کو سب پاگل کہتے ہیں یہ سب لوگ ہم کو زہر دینا چاہتے ہیں تم بڑے اچھے ہو ہم کو اچھا کہتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس کی طرف بڑھے اور اس کے پیر پکڑ کر دبانا شروع کر دیئے اس وقت اگر مسافر کی حرکت قلب کو دیکھ کر اس کے اختلاج کا اندازہ کیا جاتا تو غالباً ڈاکٹر اور حکیم اس کو مرنے کے قریب سمجھتے لیکن بیچارہ اپنی سانس روکے ہوئے بیٹھا تھا کہ جو قسمت میں لکھا ہے ہو کر رہے گا۔ خدا نے اس کی مشکل آسان کر دی اور ٹونڈلہ سٹیشن آ جانے سے اس کی جان میں جان آ گئی گاڑی کے ٹھہرتے ہی ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ' ہم لوگ ٹونڈلہ سے آگرہ جانے والی گاڑی پر روانہ ہو کر پہنچے اور سٹیشن سے سیب بازار کے ایک ہوٹل میں پہنچ کر اپنا سامان رکھ دیا۔ آگرہ میں حضرت فانی بدایونی' مولانا سیماب صدیقی' حضرت ساغر نظامی اور حضرت مانی جائسی سے ملنا تھا لہٰذا سب سے پہلے فانی صاحب کی تلاش شروع ہوئی اس لئے کہ ساغر صاحب کے آگرہ میں موجود ہونے کا شبہ بھی

نہ تھا اور سیماب صاحب کے متعلق یقین تھا کہ اگر ان سے ملے تو پھر وہ گرفتار کر کے رہا کرنا بھول جائیں گے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تمام آگرہ سے چھٹی کر کے سیماب صاحب سے ملا جائے تاکہ اگر وہ گرفتار بھی کر لیں تو کوئی پروا نہ ہو فانی صاحب کا مکان اس طرح ڈھونڈھا گیا کہ اگر خدا کو ڈھونڈھا جاتا تو مل جاتا لیکن وہ ملنا نہ تھا نہ ملے آخر کار مجبور ہو کر ہمارے قائداعظم نے ایک راہگیر کو پکڑ لیا اور فانی صاحب کا پتہ پوچھ کر بھی اس کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو دس بجے تک اپنے ساتھ رکھا وہ شخص بھی اپنے گھر کا فالتو معلوم ہوتا تھا کہ بلاوجہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا بلکہ ہم کو تو قائداعظم اور اس اجنبی کے فوراً پیدا ہونے والے گہرے تعلقات دیکھ کر دال میں کچھ کالا کالا نظر آنے لگا اور ہمارا یہ شبہ بیجا بھی نہ تھا اس لئے کہ وہ صاحب جس حد تک مسافر نواز تھے اسی حد تک ہمارے قائداعظم بے تکلف' لیکن خدا کا شکر ہے کوئی ناگفتہ بہ قسم کی واردات نہیں ہوئی' ہاں تو ان خضر اکبر آبادی کی مدد سے ہم سب حضرت فانی بدایونی کے در دولت پر پہنچے اور فانی صاحب سے مل کر ان کا کلام سنا اپنا کلام سنایا اور دوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کر کے اس انداز سے لوٹ آئے کہ اب تو گھر دیکھ ہی لیا ہے فانی صاحب کے یہاں سے واپسی پر ہمارا قافلہ نائی کی منڈی پہنچا جہاں قصر الادب مقفل تھا لیکن ہم کو راستہ ہی میں اپنے قیس صفت دوست تبسم نظامی سے معلوم ہو چکا تھا کہ سیماب صاحب تو آگرہ سے باہر ہیں لیکن ساغر صاحب آگرہ کے اندر ہیں' لہٰذا ہم قصر الادب کے قفل کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوئے بلکہ سیدھے سیماب صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے جہاں آواز دیتے ہی ہماری امیدیں اس طرح پوری ہوئیں باب اجابت سے وہ شخص برآمد ہوا جس کو دنیا تو خیام العصر خالق جذبات حضرت ساغر نظامی علیگ مدیر پیمانہ و مستقل واستقلال و مصنف نہیں معلوم کیا کیا کہتی ہے لیکن یہ خاکسار ذرا گستاخی سے صرف ساغر یا بہت پیار آیا تو شریر ساغر کہتا ہے ساغر مجھ کو اور میں ساغر کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ گویا اب کی کسی عظیم الشان دنگل میں ہم دونوں کی کشتی ہے لیکن یہ کیفیت باقی رہنے والی نہ تھی لہٰذا نہ رہی اور ہم دونوں اس طرح بغل گیر ہو گئے گویا توام پیدا ہوئے تھے۔ یہ معانقہ تو تھا وہ جس پر کیوپڈ اپنی نورانی جھنڈی ہلاتا ہے اس کے بعد ساغر صاحب نے جتنے معانقے فرمائے وہ سب ایسے تھے کہ ''چہ دشمن چہ دوست'' منظر صاحب سے ملے اعجاز سلمہ سے ملے' سجاد میاں سے ملے یہ سب اور ایک ان سے چھوٹے سیماب صاحب کے حسب مراتب صاحبزادے ہیں سیماب صاحب کے مکان سے باتیں کرتے اور شکوے شکایتیں کرتے ہوئے ہم سب قصر الادب پہنچے جو ہمارے لئے کھول دیا گیا تھا۔ یہاں پہنچنے پر ساغر صاحب کو لاحول ولاقوۃ' ساغر کو ہمارا سامان نہ دیکھ کر حیرت ہوئی' تعجب ہوا غصہ آیا' رنج ہوا اور آخر انہوں نے جواب طلبی کر ہی لیا بلکہ فوراً ہم کو ہوٹل بھیج کر تمام سامان منگا لیا یہ سب کچھ میں پہلے ہی جانتا تھا لیکن کیا کرتا اگر میں ہوتا تو ایسی غلطی کرتا بھی نہیں ستم یہ تھا کہ بجائے ''میں'' کے ''ہم'' تھے بہر حال ہوا وہی جس کا مجھے یقین تھا کہ سب قصر الادب میں

مہمان ہو گئے جہاں خلوص اوڑھا جاتا ہے خلوص بچھایا جاتا ہے خلوص کھایا جاتا ہے اور خلوص پیا جاتا ہے رات کے اس وقت جس کو آدھی رات کہتے ہیں شاعری اور شاعری بھی ساغر کی شاعری' منظر کی شاعری' اعجاز کی شاعری ہوتی رہی اس کے بعد ہم سب سو گئے' صبح بیدار ہوئے تو مولانا سیماب صدیقی اخبار ''تاج'' کی کرسی ادارت پر بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے اب تک تو خیر ہم کو شبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا کہ مولانا سیماب بجائے چار کے پانچ چھ عناصر سے مرکب ہیں یعنی غور فرمایئے کہ آدھی رات کے بعد جو شخص طول طویل سفر سے واپس آیا ہو وہ صبح تڑکے اخبار کا کام کس طرح کر سکتا ہے لیکن جناب ان کو ہم نے اب تک تو بگوش خود سنا تھا لیکن اب بچشم خود دیکھ بھی لیا کہ تمام دن اسی طرح کام کرتے رہے اگر ہم خدانخواستہ اتنا کام کریں تو تھوڑے ہی دنوں میں یا تو مر جائیں ورنہ بجائے انسان کے خدا جانے کیا وہ جائیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دنیا ایسے ہی لوگوں پر قائم ہے یہ لوگ دراصل انسان تھوڑی ہیں دنیا کو قائم رکھنے کے لئے کھمبے ہیں مولانا سیماب اپنے کام میں مصروف تھے اور ہماری تواضع میں بھی اس کے بعد بھی معلوم ہوتا تھا کہ گویا بات ہی نہیں ہے۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم سب فانی صاحب اور مانی صاحب سے ملنے گئے اور وہاں سے واپسی پر سیماب صاحب کے یہاں لذیذ ماحضر تناول فرمایا کھانے میں غیر معمولی جلدی کی اس لئے کہ اس کے بعد دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک کو دیکھنے کی باری تھی لہٰذا کھانا کھا کر ہم سب ساغر کے ہمراہ تاج محل پہنچے۔ یہ وقت اگر حاصل زندگی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ حاصل ہندوستان ہمارے پیش نظر تھا کیا عرض کیا جائے کہ ساغر اور مولانا سیماب نے تاج محل نمبر میں اس کے متعلق سب کچھ لکھ دیا ہے ورنہ کم ازکم یہ ضرور عرض کرتا کہ ممتاز محل ایک عورت کی شکل میں دفن ہوئی تھی اور عمارت بن کر نمایاں ہو گئی۔

سب کہاں کچھ تاج بن کر پھر نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز محل کا بیج جمنا کے کنارے بویا گیا' اس سے جو درخت نکلا ہے وہ تاج محل ہے تاج محل کو دیکھ کر معلوم نہیں کس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ہماری آنکھیں تو بند ہوئی جاتی تھیں۔ اچھا' ایک بات ہے کہ اگر سوراج مل جانے کے بعد تاج محل ہم کو سکونت اختیار کرنے کے لیے دے دیا جائے تو ہم آج ہی قومی تحریک میں دامے' درمے' قدمے' سخنے شریک ہونے کو تیار ہیں' لیکن مہاتما گاندھی تحریری وعدہ کریں گو ہم جانتے ہیں کہ وعدہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے خود انگریز ہندوستان کو محض اس لئے نہیں چھوڑتے کہ تاج محل ان کے قبضے سے نکل جائے گا اگر تاج محل کو کسی طرح انگلستان کے بکنگھم پیلس میں پہنچا دیا جائے تو آج ہی سوراج

مل جاتا ہے لیکن اس کو انگلستان پہنچانے میں بھی بڑی بڑی دقتیں ہیں ورنہ یہ انگریز تاج محل کو کبھی آگرہ میں نہ رہنے دیتے تاج محل کے متعلق صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس کی تعمیر کے بعد خداوند کریم کو جنت کا معیار بلند کرنے کی فکر ہوئی ہوگی۔

تاج محل کی سیر کے بعد ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ اس کے مینار پر چڑھ کر لہراتی ہوئی جمنا کا اور اپنی گومتی کا موازنہ کریں لیکن جب مینار پر پہنچ کر ہم نے جمنا کو دیکھنا چاہا تو سر چکرا گیا اور معلوم ہونے لگا کہ گومتی کا پانی جمنا میں گرا ہی چاہتا ہے۔ ساغر اور امین کا خدا جانے کیا حال تھا لیکن یہاں تو خدا کے گھر سے قریب تر ہو کر اول کلمہ طیب ورد زبان تھا خدا خدا کر کے وہاں سے واپس آئے اور سمجھے کہ خدا کے گھر سے پھرے ہیں کہ مرنے کے لئے وہاں سے گرنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہاں چڑھ جانا ہی کافی ہے۔

تاج محل سے واپسی پر ہمارے میزبان ہمارے محافظ تھے اور ہم اس طرح ''گومتی سے جمنا میں'' لکھ رہے تھے گویا سکول میں بیٹھے ہوئے حساب لگا رہے ہیں یہ سب اس ساغر کی عنایتیں تھیں جو تاج محل سے بھی زیادہ مجھ کو عزیز ہے اور جس کو میں تاج محل کے عوض بھی اپنے دل سے نکال کر کسی کو نہیں دے سکتا مضمون ختم ہونے کے بعد غالباً ہم واپس ہی ہو گئے تھے یعنی ''جمنا سے گومتی میں''

◆ ◆ ◆

مٹھو بیٹے

''ہیرامن طوطے کا بچہ''

یہ تھی وہ آواز جو گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں لو کے جھونکوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کے کان تک پہنچی اور وہ پنکھا ونکھا چھوڑ کر گڑبڑا کو اٹھ بیٹھیں' پہلے تو ہماری طرف دیکھا لیکن ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ ہونے والا ہے اور ہم سے کہا جائے گا کہ اس دھوپ میں نکل کر طوطے والے کو بلائیں لہذا ہماری آنکھیں ان کو بند ملیں آخر بیچاری نے گلشن کو بلا کر طوطے والے کو بلانے کی ڈیوٹی سپرد کردی کہ

''دیکھ میری گلشن کہیں طوطے والا نکل نہ جائے' لپک کے بلا لے''

گلشن کی ایک ہی آواز پر طوطے والا گویا گھر ہی پر موجود تھا اور طوطے کے بچے دکھانے کے لئے گلشن کے ہاتھ میں ایک' دو' تین چار پانچ غرضیکہ درجنوں طوطے کے بچے بیگم صاحبہ کو پسند کرانے کے لئے بھیجے جانے لگے جن میں سے ایک آدھ پر دام بھی لگائے گئے لیکن آخر میں تھوڑی دیر کی دس آنہ اور چھ آنہ کی ہاں نہیں کے بعد ایک بے بال و پر ڈراؤنی شکل کا بچہ سات آنہ میں خریدا گیا اور دام لے کر طوطے والا رخصت ہوا اب ہم بھی بیدار ہو چکے تھے یعنی ہم نے اپنی مصلحتاً بند کر لینے والی آنکھیں کھول دی تھیں ہم کو بھی وہ طوطے کا بچہ اس شوق کے ساتھ دکھایا گیا گویا ہونہار اولاد دکھائی جارہی ہے لیکن ہم نے اس طوطے کے بچے کو ہاتھ تو میں خیر لیا ہی نہیں اور دیکھا بھی تو نفرت کی نظروں سے وہ گوشت کی ایک بے تکی سی بوٹی معلوم ہوتا تھا لیکن جب بغور دیکھا تو اور ہی کچھ پایا' طوطا تو خیر وہ کسی طرح معلوم ہی نہ ہوتا تھا البتہ اس کو چھوٹی قوم کے اونٹ کا بچہ کہا جا سکتا تھا وہی لمبے لمبے پیر تھے وہی لمبی سی گردن پر رکھا ہوا ہانڈی نما سر وہی لٹکا ہوا پوٹا' اور وہی کوہان کی جگہ بے پر کے بازو' چونچ تو خیر تھی لیکن دم وغیرہ کا پتہ نہ چلتا تھا مختصر یہ کہ دیکھ کر سخت متلی آئی مگر کچھ نہ کہہ سکے کہ بیگم صاحبہ کو برا معلوم ہوگا وہ تو کس شوق سے طوطے کے بچے کو گود لے رہی ہیں اور ہم اس کے متعلق نفرت کا اظہار کریں لہذا یہی کہہ کر رہ گئے۔

''ابھی بہت چھوٹا ہے کہیں مر نہ جائے''

لیکن بیگم صاحبہ کو یہ بھی برا معلوم ہوا اور وہ ذرا بگڑ کر بولیں۔

''خدا نہ کرے وہ مرے' مرنے کیوں لگا' وہ تو بڑا اچھا نکلے گا' دیکھ لیجئے گا''

ہم: ’’ظاہر ہے‘‘

وہ: ’’ظاہر کیا ہے ذرا بڑھنے دیجئے پھر دیکھئے کیسا فرفر بولتا ہے آپ اس کے لیے کل ایک خوب صورت سا پنجرہ اور دو چھوٹی چھوٹی پیالیاں لا دیجئے گا۔‘‘

ہم نے ہاں ہوں کر کے بات ٹال دی کہ اب اگر زیادہ گفتگو ہوئی تو طوطے کے لئے موٹر اور بائیسکل وغیرہ کی بھی فرمائش ہو جائے گی اور اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے بیگم صاحب بھی اپنے طوطے کا بچہ لے کر گھر بھر کو دکھانے کے لئے ہمارے پاس سے چلی گئیں اور اس کے بعد سے ہم نے ان کی تمام تر توجہ طوطے کے بچے کی طرف دیکھی پہلے تو اس گوشت کی بوٹی کو زندہ رکھنے کی تدابیر ایک مستقل شغل کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن جب خدا نے وہ دن دکھایا کہ اس کے پر بھی نکل آئے اور وہ طوطے کی شکل کا ہو گیا تو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر بیگم صاحب کو چین نہ لینے دیتی تھی اور بیگم صاحب کے علاوہ خود ہمارا ناک میں دم تھا جب دیکھئے وہ تو پنجرا سامنے رکھے سبق پڑھا رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ہمارے دماغ میں اول تو کچھ آتا ہی نہیں اور اگر آیا بھی تو طوطے کے سبق کے ساتھ فوراً نکل گیا بارہا ایسا ہوا کہ قلم لئے بیٹھے ہیں اور کچھ لکھنے کا ارادہ ہے لیکن بیگم صاحب چہ چہ اور طوطے کی ٹیں ٹیں دماغ میں گونج رہی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں بمشکل تمام زبردستی لکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بیگم صاحب کی آواز اور ان کے شاگرد رشید کی ٹیں ٹیں اس ارادے کو بھی لے اڑی آخر ہم نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور اس درس تدریس کو دیکھنے لگے۔

بیگم صاحب: ’’چچ چچ مٹھو بیٹے، بی جی بھیجو مدد اللہ کی۔‘‘

مٹھو بیٹے: ’’ٹیں ٹیں‘‘

بیگم صاحب: ’’حق اللہ پاک ذات، اللہ پاک نبی رسول اللہ بولو۔‘‘

مٹھو بیٹے: ’’چچ چچ‘‘

مٹھو: ’’ٹیں...... ٹیں‘‘

بیگم صاحب: ’’بیوی کا پیارا پیارا مٹھو ہے مٹھو بیٹا ہے چچ چچ‘‘

’’پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی۔‘‘

’’بولو مٹھو بیٹے‘‘

مٹھو بیٹے......‘‘

بیگم صاحبہ: شہید و خدا خدا کا رسول، غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول، بندے اللہ کے امت رسول۔ بولو مٹھو بیٹے، پچ پچ"

مٹھو بیٹے: "ٹیں ٹیں، ٹیں ٹیں"

بیگم صاحبہ: "پیر فقیر اٹھا بستر چل مکہ کی زیارت کو، پیر علی مرتضٰی مدد بولو مٹھو بیوی کے پیارے مٹھو میاں کے دلارے مٹھو"

مٹھو بیٹے: "ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں...... ٹیں ٹیں"

بیگم صاحبہ: "بولو مٹھو بیٹے نبی جی بھیجو پیا سو سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی اور پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی مٹھو بولو۔"

اب بتائیے کہ ایسی حالت میں ہمارا دماغ کس کام کا رہ سکتا تھا اور ہمارے ذہن میں سوائے اس کے اور کیا آ سکتا تھا کہ "مٹھو بیٹے نبی جی بھیجو مدد اللہ کی" مٹھو بیٹے تو خیر کیا سیکھتے، البتہ ہم سوائے نبی جی بھیجو کے سب کچھ بھول گئے اور واقعی جب دن رات مٹھو بیٹے کے ساتھ ہم کو یہ سبق پڑھایا جاتا تھا تو ہم کب تک یہ سبق یاد نہ کرتے بلکہ ہم کو تو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ہم خود مٹھو بیٹے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ تو کہیے کہ مٹھو بیٹے صاحب کچھ ایسے کند ذہن واقع ہوئے تھے کہ ان کو سبق ہی یاد نہ ہوتا تھا اور بس "ٹیں ٹیں" کر کے رہ جاتے تھے ورنہ ایک مرتبہ تو بیگم صاحبہ ان کو سبق پڑھاتیں اور دس مرتبہ وہ سبق سنا کر ہمارے رہے سہے دماغ کو خراب کرتے پھر بھی صرف ان کی ٹیں ٹیں" آپ کی دعا سے اتنا اثر ضرور رکھتی تھی کہ ہر مرتبہ کان کے پردے پھاڑتی ہوئی دماغ میں گونجی تھی اور دماغ میں گونج کر دماغ سے پار ہو جایا کرتی تھی، خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب کوئی پنجرے پر ہاتھ رکھ دیتا یا ان کے خاصہ کی پیالیاں نکالنے کے لئے پنجرے میں ہاتھ ڈالا جاتا اس وقت تو بس کچھ نہ پوچھیے، معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی ہے اور صور پھونکا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے پر پھڑپھڑا کر پنجرے سے زمین اور آسمان کو ایک کر دیتے تھے او دوسری طرف ان کی مسلسل "ٹیں ٹیں" ہمارے دماغ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتی تھی۔ یہ تو گویا ان کی نا سمجھی اور نادانی یعنی بچپن کا دور تھا لیکن جب وہ نام خدا جوان ہو گئے اور برے بھلے کی تمیز کرنے لگے تو آفت آئی اب تو نیولے کا دکھائی دے جانا، بلی کا نظر آنا یہ سب مصیبت ہو گیا، بلی کو دیکھ کر تو وہ اس طرح چیختے تھے کہ گویا یہ آخری مرتبہ چیخ رہے ہیں اور اس کے بعد ان کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جانا ہے لہٰذا پورا زور صرف کر رہے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ چیختے تھے اور دوسری طرف بیگم صاحبہ اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر "بل بل بل" کہتی ہوئی دوڑتی تھیں ہزار مرتبہ کہا کہ تم خواہ مخواہ دوڑتی ہو کہیں بند پنجرے سے بلی طوطے کو نکال بھی سکتی ہے لیکن ان کو تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں بلی کو دیکھ کر ان کے طوطے کا ننھا سا کلیجہ دہل نہ جائے اسی بلی سے بچانے کے واسطے جو احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں وہ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ تھیں۔ ایک تو پنجرہ خود ایسا تھا کہ اس میں بلی کا گزرنا ممکن، پھر دن بھر وہ پنجرہ بیگم صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا اور رات کو زمین سے چھ فٹ بلند ٹانگ دیا جاتا تھا کہ بس بلی کی نظریں تو جا سکیں لیکن وہ خود نہ پہنچ سکے اور نظروں سے بچانے کے لئے بھی پنجرے پر ایک

غلاف تھا۔ مختصر یہ کہ بیگم صاحب نے اپنے نزدیک بلی تو بلی مٹھو بیٹے کو ملک الموت سے بھی بچانے کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا لیکن اس قسم کی باتیں اللہ میاں کو بری معلوم ہوتی ہیں آخر رات جب کہ سارا گھر گہری نیند کے خراٹے لے رہا تھا ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ مٹھو بیٹے کی ٹیں ٹیں نے سب کو گڑبڑا کر اٹھا دیا اور اسی کے ساتھ بیگم صاحب کی آواز "ہائے میرا مٹھو ہائے میرا طوطا" تو شاید گھر سے نکل کر محلہ والوں کو بھی جگا دینے کے لئے کافی تھی، ہم آنکھیں ملتے ہوئے بوکھلائے ہوئے پنجرے کی طرف دوڑے، دل کی حرکت تو ویسے ہی بڑھی ہوئی تھی اس پر سے بیگم صاحب اور ہاتھ پیر پھلائے دیتی تھیں ہم بلی کا تعاقب بھی کر رہے تھے اور بیگم صاحب سے کہتے بھی جاتے تھے کہ "ٹھہرو بھی، ذرا صبر کرو، چپ تو رہو" لیکن وہ تھیں کہ بے قابو ہوئی جاتی تھیں۔

"ارے اب کیوں دوڑ رہے ہو کمبخت نے میرے مٹھو کو چبا بھی ڈالا ہوگا، اللہ کرے اس کو بھی اسی طرح موت آئے ارے میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اگر مٹھو کا پنجرہ درست نہ کرایا گیا تو ایک دن یہی ہوگا۔ پنجرہ کی کھڑکی موئی جس دن سے ڈھیلی ہوئی، پھر لاکھ لاکھ کہا کسی نے درست نہ کرائی اب تو سب کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی اب تو وہ بولنے بھی لگا تھا میں نے اس کو بوٹی ایسا مول لے کر پالا تھا۔ اب کیسا موٹا تازہ ہو گیا تھا" بیگم صاحب نے الگ گھر سر پر اٹھا رکھا تھا اور مٹھو بیٹے الگ بلی کے منہ سے "ٹیں ٹیں" کر رہے تھے۔ آخر کار ایک آدھ گھنٹہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ہمارا لٹھ بلی پر پڑا اور اس نے مٹھو کو منہ سے چھوڑا اور مٹھو پر جھاڑ کر خاموش ہوئے اب ان کا طبی معائنہ شروع ہوا کہ ضرب شدید ہے یا خفیف؟ بیگم صاحب تو خیر اب بھی مایوس تھیں لیکن اور لوگوں نے کہا کہ کوئی زخم نہیں آیا ہے خدا نے بال بال بچا لیا۔

مٹھو بیٹے کو بلی کے منہ سے بچانے کو تو ہم نے بچا لیا، لیکن بعد میں اپنی اس حماقت پر افسوس بھی ہوا کہ یہ قصہ ختم ہو رہا تھا تو ایک دن کی آفت اور مصیبت برداشت کر کے ختم ہو جانے دیتے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے، مٹھو بیٹے کی زندگی تھی، لہٰذا بلی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور وہ زندہ رہے لیکن اب تو ہم کو بھی ان سے محبت ہو گئی تھی، اس لئے کہ بیگم صاحب نے تعلیم دینا چھوڑ دی تھی اور وہ خود ایک تعلیم یافتہ کی طرح ہر وقت قابلیت بگھارا کرتے تھے بلکہ ہم پر تو ایسے مہربان تھے کہ ہمارا اب ان سے خفا ہونا محسن کشی او احسان فراموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا صبح تڑکے سب سے پہلے مٹھو ہی کی آواز سنائی دیتی تھی جو گلشن کو اٹھاتے تھے۔

میاں کا پیارا مٹھو ہے گلشن اٹھ، میاں کے لئے چائے لا، نبی جی بھیجو مدد اللہ کی، چچ چچ

اور اس کے بعد جب وہ سب سے پہلے ہم کو دیکھتے تھے تو خود بخود فرماتے تھے۔

"میاں آداب عرض کرتا ہے مٹھو میاں کا پیارا پیارا مٹھو حق اللہ پاک ذات اللہ چچ چچ پاک نبی رسول اللہ۔"

اور بیگم صاحب کا تو یہ حال تھا گویا جوان اولاد سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو رہا ہے بڑھاپے میں سکھ پا رہی ہیں جس وقت مٹھو بولتا تھا بس

ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی تھیں حالانکہ اب فخر آمیز انکسار کے ساتھ ہمیشہ گردن جھکا لیا کرتی تھیں یا اس لئے گردن پھیر لیا کرتی تھیں کہ کہیں خود اپنی ہی نظر نہ لگ جائے لیکن دیکھنے والے دیکھ لیتے تھے کہ ان کا دل باتھ بھر کا ہو گیا ہے اور واقعی ان کی یہ کیفیت قدرتی بھی تھی اول تو مٹھوان کا شاگرد رشید تھا دوسرے اس کو اولاد کی طرح پالا تھا پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ آج جب وہ پروان چڑھا تھا تو بیگم صاحبہ کا دل باغ باغ نہ ہوتا۔

ایک دن حسب معمول ہم سو کر اٹھے تو مٹھو بیٹے نے ہم سے کہا "میاں کا پیارا مٹھو میاں آداب عرض کرتا ہے مٹھو بیٹا!" بیگم صاحبہ بھی بیدار ہو چکی تھیں کہنے لگیں، دیکھو تو کیسے ادب کے ساتھ سلام کر رہا ہے اور تم جواب بھی نہیں دیتے ہم نے پنجرے کی طرف دیکھ کر کہا جیتے رہو مٹھو بیٹے" "مٹھو بیٹے نے کھڑکی سے گردن نکال کر کہا "میاں آداب کرتا ہے مٹھو بیٹا کھڑکی پنجرہ سے علیحدہ ہو کر زمین پر آ رہی اور مٹھو بیٹے پھر سے اڑ کر یہ جا وہ جا بیگم صاحبہ "ارے ارے کہہ کر رہ گئیں اور ہم اس کی طوطا چشمی دیکھ کر رہ گئے وہ پہلے تو اڑ کر دیوار پر بیٹھے لیکن جیسے ہی ان کو پنجرہ دکھا کر کہا گیا "آؤ آؤ مٹھو بیٹے آؤ" وہاں سے اڑ کر گولر کے درخت پر، اور پھر وہاں سے خدا جانے کہاں اڑ گئے، ان کا پنجرہ اب بھی موجود ہے جس کو دیکھ کر بیگم صاحبہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں، ہاں ان کے چنے کی دال والی گلھیا خدا جانے کیا ہو گئی مگر خیر اتنا ضرور ہوا کہ اب جب کبھی آواز آتی ہے" "ہیرامن طوطے کا بچہ" تو بیگم صاحبہ جل کر کہہ دیا کرتی ہیں۔

"آگ لگے کم بخت میں"

◆ ◆ ◆

بائیسکل کی تعلیم

ابھی قد اتنا بھی نہ تھا کہ پیر آسانی کے ساتھ بائیسکل کے پیڈل تک پہنچ سکیں کہ سائیکل سواری کے شوق نے گدگدایا اور رفتہ رفتہ اس شوق نے ارمان' آرزو اور تمنا وغیرہ کے تمام مدارج طے کر کے عشق کی صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ اب بغیر سائیکل کے زندگی دشوار ہو گئی ہر وقت اسی کا تذکرہ ہے اور رات کو خواب بھی دیکھتے ہیں تو بائیسکل کا بات یہ تھی کہ سڑکوں پر کثرت سے اپنے ہم عمروں کو اور اپنے سے بڑے لوگوں کو بائیسکل پر فرآٹے بھرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے کہ ایک یہ ہیں جن کو زندگی کا لطف حاصل ہے دنیا میں بہشت کے مزے اڑا رہے ہیں بائیسکل کے مالک ہیں اور بائیسکل پر بیٹھ کر ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔

ایک ہم بدقسمت ہیں کہ ہماری قسمت میں اور سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو صرف سائیکل۔

جب شوق بڑھ کر عشق کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس وقت اس کا ضبط کرنا انسانی طاقت سے باہر ہوتا ہے خصوصیت کے ساتھ بچپنے میں تو عشق ہو جانا قیامت سے کم نہیں ہوتا' چنانچہ ہمارے بزرگوں کو ہماری دلی کیفیت کا علم تھا بلکہ وہ ہماری مجنونانہ حالت سے تنگ آ گئے تھے اور کسی نہ کسی طرح ہم کو مطمئن کرنے کی فکر میں تھے۔ آخر کار ادھر سے یہ شرط پیش کی گئی کہ سوار ہونا سیکھ لو تو خرید لی جائے اور ادھر سے یہ ضد تھی کہ خرید دو تو سیکھ لیں گے لیکن یہ گفت وشنید کچھ ہمارے بڑے بوڑھے جھکے اور کچھ ہم اور آخر کار یہ طے پایا گیا کہ ہم کسی پرانی بائیسکل پر سوار ہونا سیکھ کر مشق کر لیں تو نئی خرید لی جائے گی ورنہ نئی بائیسکل ٹوٹ کر سیکھ چکنے سے پہلے ہی ہم کو پھر نئی بائیسکل کی تمنا میں مبتلا کر دے گی۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ شوق شوق سب برابر ہوتے ہیں خواہ وہ بائیسکل کا ہو یا خان بہادری کا' جیل جانے کا ہو یا گول میز کانفرنس جانے کا' جہاں تک شدومد اور جوش وخروش کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ کوئی شوق بھی اس سے خالی نہیں ہوتا اور پھر جوش وخروش میں انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ اس کو ہم بھی جانتے ہیں اور وہ بھی جانتے ہوں گے جو آنریری مجسٹریٹی سے لے کر میونسپل کمشنری اور کونسل یا اسمبلی کی ممبری تک کے کسی شوق میں شدومد اور جوش خروش سے کام لے چکے ہیں یا لینے والے ہیں اس وقت انسان ایک قسم کی مرفوع القلم مخلوق ہوتا ہے جس کے یہاں جائز اور ناجائز ہر قسم کی تدابیر یکساں ہوتی ہیں اور وہ ان کو اختیار کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کرتا چنانچہ یہی ہوا کہ پرانی بائیسکل کی جستجو میں اتفاق سے بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی یعنی ایک دن کوئی صاحب بائیسکل پر سوار ہو

کر ہمارے کسی بزرگ سے ملنے آئے وہ تو ادھر ملتے رہے اور ادھر ان کی بائیسکل ہمارے کام آئی بائیسکل لے کر کمپنی باغ کی اس سڑک پر پہنچے جو فراز سے نشیب کی طرف گئی تھی اور وہاں فطرت کو بہترین معلم جان کر ہم نے بائیسکل کی بسم اللہ کر دی۔

بائیسکل کے پیڈل پر بایاں پیر رکھ کر داہنا اٹھایا ہی تھا کہ وہ بجائے آگے چلنے کے لہرا کر اس طرح لیٹ گئی کہ ہم نصف اس کے فریم میں اور نصف زمین پر دراز نظر آئے لیکن ہم مردانہ وار اٹھے کپڑے جھاڑے اور بہادرانہ بائیسکل کو اٹھا کر پھر کوشش کی اس مرتبہ بائیسکل تھوڑی دور چل کر خود بخود لڑکھڑائی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس طرح گری کہ ہم بائیسکل کو ہاتھ میں لئے لئے قلابازی کھا گئے اور تھوڑی بہت چوٹ بھی آئی لیکن ہم نے کہا۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

ہاتھوں سے گھٹنوں کو سہلاتے ہوئے ہم نے پھر مشق کی اور یہ مشق کامیاب رہی اس لئے کہ ہم بجائے گرنے کے بائیسکل کو گرا کر خود کھڑے ہو گئے اور جب وہ اچھی طرح گری تو پھر اس کو اٹھا کر چلے' لیکن اب کی مرتبہ بائیسکل کو گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح ٹٹی پھاندنا پڑی' یعنی سڑک پر آرام فرمانے والے گدھے سے ٹکرا کر وہ خود ادھر جا رہی اور ہم کو گدھے کا سہارا لے کر اسی کی پیٹھ پر بیٹھ جانا پڑا۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہ تھی گدھے کے اٹھنے سے پہلے ہم خود اٹھے اور بائیسکل کو اس عزم کے ساتھ اٹھایا کہ دیکھیں کہاں تک گرتی ہے یا ہم ہی نہیں یا تو ہی نہیں' اس وقت ہم کو غصہ آ جانا ذرا مفید ہوا کہ ہم نہیں معلوم کتنی مرتبہ غصہ میں خود بخود پیدا ہو جانے والی تیزی کے ساتھ بائیسکل اٹھا اٹھا کر مشق کرتے رہے' یہاں تک کہ بائیسکل نے گرنا چھوڑ دیا یا گری تو اس طرح کہ خود گر پڑی اور ہم سنبھل گئے۔

جب ہی مشق اس حد تک پہنچ چکی تو ہم ایک درخت کے سہارے سے گدی پر بیٹھ گئے اور بائیسکل کو چھوڑ دیا جو نہایت تیزی کے ساتھ لہراتی ہوئی اس حد تک چلی کہ اگر نالے کے پل سے نہ ٹکرا جائے تو مع ہمارے یقیناً بجائے خشکی کے اس کو تری میں چلنا پڑے' لیکن وہ نالہ کے پل سے ٹکرائی اور ہم کو منہ کے بل گرنا پڑا' گرنے کی تمام تکلیف اس خیال نے ذہن سے نکال دی کہ ہم بائیسکل پر اتنی دور چل کر گرے ہیں لہٰذا پھر وہیں گئے جہاں سے چلے تھے اور پھر اسی طرح سوار ہو کر بائیسکل چھوڑ دی لیکن بائیسکل کے روانہ ہوتے ہی معلوم نہیں کمبخت دھوبنیں کہاں سے اس سڑک پر آ گئیں لاکھ لاکھ چیخے چلائے' ہٹو بچوں کیا مگر جدھر وہ ہٹیں اسی طرف بائیسکل بھی مڑی اور آخرکار ان کی گٹھری سے الجھ کر ہم بھی گرے بائیسکل بھی گری اور ان میں سے بھی ایک بڑھیا مع گٹھری کے چاروں شانے

چت ہوگئی وہ یقیناً مری نہیں تھی اس لئے کہ برابر ہم کو کوس رہی تھی اور ہم اس کی خوشامد کر رہے تھے بہ مشکل تمام اس کو وہاں سے روانہ کیا اور ارادہ کرلیا کہ اب سوار نہ ہوں گے مگر دل نے کہا کہ واہ۔

دو چار ہاتھ اب تو لب بام رہ گیا

لہذا پھر ایک مرتبہ ہم کی اور بائیسکل پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ لیکن چونکہ اترنا نہیں آتا تھا لہذا یہ ضروری تھا کہ کہیں نہ کہیں گریں ورنہ بائیسکل کا چلنا بند نہیں ہو سکتا تھا لہذا اس خیال سے ہم مطمئن تھے کہ کہیں نہ کہیں گرنا ضرور پڑے گا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ گریں کہ چوٹ بھی نہ آئے اور گالیاں بھی نہ کھائیں۔ اگرچہ ہم اس گرنے والے سانحہ کے لئے تیار تھے لیکن دل لرز رہا تھا کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے زندہ رہتے ہیں یا نہیں لیکن بائیسکل کی تیز رفتاری نے تھوڑی ہی دیر میں اس کا فیصلہ کر دیا اور ہم کو ایک نہایت ہی مقدس بزرگ سے اس بری طرح لڑایا کہ خود تو کم بخت الگ جا پڑی اور ہم کو بڑے میاں کے عین اوپر گرایا وہ بیچارے وظیفہ میں محو تھے کہ یہ ناگہانی آفت آئی غالباً ہم کو ملک الموت سمجھے ہوں گے اس لئے ہم نے اپنے ہوش بجا ہونے کے بعد ان کو کلمہ پڑھتے ہوئے دیکھا اور اپنے کو ان کے اوپر پڑا ہوا ہم جلدی سے اٹھے اور ان کو نہایت تعظیم سے اٹھا کر معافی چاہی لیکن وہ بے چارے کچھ نہ بولے صرف گھورا کئے ہم نے ان کے کپڑے خود جھاڑے اور ان کو بائیسکل کی طرح چلانے کی کوشش کی لیکن وہ ہم کو روح قبض کرنے کے انداز سے گھور رہے تھے ہم نے جب یہ عالم دیکھا تو ان کو گھورتا ہوا چھوڑ کر بائیسکل کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ ہینڈل گھوم کر دوسری طرف ہو گیا تھا چونکہ ہم کو ہینڈل کی اس ساخت کے اعتبار سے اگلے پہیئے کی طرف سے سوار ہونا نہیں آتا تھا لہذا سائیکل سواری کی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر چوروں کی طرح مجروح بائیسکل لئے گھر آئے اور گھر پر جو کچھ ہوا وہ اس لئے قابل تحریر نہیں کہ اب بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

◆ ◆ ◆

بڑے اچھے آدمی تھے

رسالہ ''خضرراہ'' میں لکھنے کا پہلا اتفاق ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کے مدیر جناب حامد ندوی میرے دوست بلکہ میرے یار غار عبدالمجید صاحب کمال حامدی کے دوست بلکہ یار غار ہیں۔ لہٰذا اقلیدس کے قاعدے سے وہ میرے بھی دوست ہوئے اور جب دوست ہو گئے تو ان سے جان چھڑانا جس قدر دشوار ہے اس کو وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جن کو خدا نے دوست دیئے ہیں' بس یہ سمجھ لیجئے کہ لکھ کیا رہا ہوں دوستی نباہ رہا ہوں اور وہ بھی مار کے خوف سے آپ جانتے ہوں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے میں تو پھر بھی شوکت تھانوی ہوں۔

یعنی حامد صاحب کی زبردستی ملاحظہ فرمایئے کہ فرماتے ہیں کہ ''خضرراہ'' کے ''شبلی نمبر'' کے لئے لکھو اور لکھو بھی تو مزاحیہ مضمون لکھو ان ذات شریف ایڈیٹر صاحب سے لاکھ لاکھ کہا کہ بھائی شبلی نمبر کے لئے کیا لکھوں جہاں تک علامہ شبلی کی سوانح زندگی کا تعلق ہے میں بالکل کورا ہوں یہ اور بات ہے کہ میں نے کلیات شبلی وغیرہ دیکھی ہے مگر اس پر کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں' دوسرے اس ذات گرامی کے متعلق جن کے نام نامی سے یہ نمبر مخصوص کیا جا رہا ہے مزاحیہ مضمون لکھوا کر مجھ کو کیوں روسیاہ بناؤ گے؟ مگر حامد صاحب ہیں کہ ''لکھو ہم نہیں جانتے لکھو'' کہے جاتے ہیں بہت اچھا ہم لکھتے ہیں لیکن کان کھول کر سن لیں تمام ندوی حضرات کہ اس جسارت کے ذمہ داران ہی کے ہم قوم یعنی ایک ندوی بزرگوار جن کو عرف عام میں حامد ندوی کہتے ہیں اور جو رسالہ ''خضرراہ'' کے مدیر ہیں' سمجھے جائیں' رہ گئے ہم تو ہم تو بس بیگار کے مضمون نگار یعنی کرایہ کے ٹٹو ہیں۔''

یہ تو سب کچھ ہو گیا لیکن لکھیں تو کیا لکھیں' خدا گواہ ہے کہ علامہ شبلی کے متعلق کسی قسم کی کوئی معلومات نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک لطیفہ ہم کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک جلسہ عام کے روبرو ایک ''میمبے'' بزرگوار علامہ کا تعارف حاضرین سے کرانے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن ان بچارے کو جب ہماری طرح دوران تقریر میں یہ محسوس ہوا کہ وہ علامہ کی خدمات پر روشنی نہ ڈال سکیں گے تو انہوں نے سب تعریفیں کرنے کے بعد کہہ دیا کہ ''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں'' اسی طرح اگر ہم نے ان کے متعلق کچھ لکھا تو اس کا ماحصل یہی ہوگا کہ ''بڑے اچھے آدمی تھے'' اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہم ان کو ''بڑا اچھا آدمی سمجھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس سے زیادہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے''

جہاں تک علامہ شبلی کا تعلق دارالعلوم ندوہ سے ہے وہ یقیناً سرسید علیہ الرحمۃ کی طرح ''بڑے اچھے آدمی تھے'' جس طرح سرسید علیہ الرحمۃ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد ڈال کر مسلمانوں کو دنیا میں ترقی کرنے کا حق دار بنایا بالکل اسی طرح علامہ شبلی کا یہ احسان بھی ناقابل فراموش ہے کہ انہوں نے دارالعلوم ندوہ جیسی درسگاہ کا انتظام فرما کے ان مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دیا جو ٹھیٹھ مذہبی تعلیم پانے کے بعد بس ''مولانا'' ہو کر رہ جاتے تھے اور کچھ نہیں اگر آج کسی عربی درسگاہ کے طالب علم کا مقابلہ کسی ''ندوی'' سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک ہندوستانی ہے تو دوسرا یورپین مسلمان یعنی لارڈ ہیڈلے کی قسم کا اگر ایک سودیشی ہے تو دوسرا بدیشی' بس یہ سمجھ لیجئے کہ ندوہ کے طالب علم ''ندوی'' ہوتے ہیں اور دوسری عربی درسگاہوں کے طالب علم ''بدوی'' ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اگر موازنہ ''انیس و دبیر'' کی طرح موازنہ ''ندوی و بدوی'' کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے بس اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ایک ندوی مولانا ہوتا ہے مگر فیشن ایبل قسم کا اور ایک بدوی ایسا سنگین مولانا ہوتا ہے گویا براہ راست عرب سے تشریف لا رہا ہے اور دنیا سے منہ موڑے ہوئے بس اللہ میاں کے یہاں جانے کا ارادہ ہے سر منڈا ہوا اس پر ایک چوگوشیہ ٹوپی منڈھی ہوئی ایک لمبا سا کرتہ اور ٹخنہ کھلا شرعی پاجامہ پہنے ہوئے کندھے پر ایک لمبا سا رومال پڑا ہوا پیروں میں ایک ہاتھ بھر کا نال جڑا ہوا پنجابی جوتا اور ہاتھ میں ایک لمبی سی تسبیح' یہ ہوتی ہے ان حضرات کی وضع قطع اور چہرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اگر واقعی ان ہی حضرات کی وضع قطع اور چہرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اگر واقع ان ہی حضرات سے جنت بھر دی گئی تو بے چاری حوریں سہم سہم کر بھاگیں گی اس وضع قطع اور چہرہ کی ساخت میں ایک چیز کا اور اضافہ ہوتا ہے اور وہ چیز ''تیور'' ہیں جن سے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جنت الفردوس میں اس شان سے یہ حضرات داخل ہوں گے جس طرح آج کل گورنر صاحب دربار میں جاتے ہیں اور جنت گویا ان لمبی لمبی داڑھیوں' گٹھے پڑی ہوئی پیشانیوں' منڈے ہوئے سروں اور تراویح نما چہروں کے بغیر بے رونق رہے گی' اگر واقعی جنت کسی ایسی ہی جگہ کا نام ہے تو غالب مرحوم نے سچ کہا ہے۔

''ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت کیا ہے''

بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دل کے بہلانے کو بھی اچھا خیال نہیں ہے یعنی اگر اس قسم کی جنت میں اتفاق سے کوئی خوش مذاق انسان بھی پہنچ گیا تو اس کی زندگی کوفت میں بسر ہوگی جبکہ دنیا ہی میں یہ حال ہے کہ اگر کسی مجمع میں اس قسم کے کوئی بزرگوار پہنچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مجمع کو سانپ سونگھ گیا نہ وہ دلچسپیاں باقی رہتی ہیں نہ لطف صحبت و زندہ دلی رہتی ہے نہ خوشگواری بس ایک مولانا کی وجہ سے تمام داڑھی منڈوں کا مجمع یاد اللہ میں مصروف ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے مولانا لوگ تسبیح پڑھنے کے لئے غیر

مولاناؤں میں تشریف ہی کیوں لاتے ہیں، خدا کے فضل سے سینکڑوں مسجدیں ان حضرات کے لئے موجود ہیں ان کی کیا ضرورت ہے کہ جبہ ودستار لئے ٹائی کالروں کے مجمع میں بغیر بلائے رونق افروز ہو جاتے ہیں اور وہاں کے رنگ کو صرف اپنے وجود سے ایسا پھیکا کر دیتے ہیں کہ بس غصہ ہی تو آتا ہے نہ تو آپ کو ٹینس سے ذوق نہ برج سے کوئی شوق بس آپ سے تو گناہ اور ثواب کی باتیں لے لیجئے۔ ہر شخص سے جواب طلب ہوتا ہے کہ آپ نے داڑھی کیوں منڈوائی، آپ نے سوٹ کیوں پہنا، آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے آپ کے روزے کیوں قضا ہو رہے ہیں آپ مسجد میں کیوں نہیں آتے؟ کوئی پوچھے کہ جناب کون ہیں جو ہر شخص پر چارج شیٹ لگاتے چلے جاتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے تو خدا کے گنہگار ہیں داڑھی نہیں رکھی تو اس کے جواب دہ خود ہیں، سوٹ پہنتے ہیں تو انگریزوں کے ساتھ حشر ہو گا یا اگر مولانا کی دھمکیوں کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو جہنم میں جائیں گے مگر آپ کی بلا سے آپ کون ہیں؟ لیکن بات اصل یہ ہے کہ مولانا لوگوں کی ان باتوں کا کھرا کھرا جواب دینا لوگ خلاف تہذیب سمجھتے ہیں ایک مرتبہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے ڈانٹ دے تو پھر جرات نہ ہو یہ لوگ تو خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہیں جب تک آدمی خاموش رہے یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ بیوقوف ہے اس کو جو کچھ جی چاہے کہو جواب تو دے ہی نہیں سکتا۔ خدا کا نہ سہی کم از کم ان باتوں سے ہمارا رعب تو جم ہی جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس بہانے سے ہمارا مرید بھی ہو جائے۔

ان بدوی قسم کے مولاناؤں کو اپنے زہد و اتقاء کی نمائش کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ ریش مبارک میں کبھی قینچی بھی نہیں لگنے دیتے کہ مبادا اختصار ہو جائے اور عوام بجائے ''مولانا'' سمجھنے کے ''دہلی کا تاجر'' سمجھنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یکمشت چار انگشت والی داڑھی ''چار مشت ایک انگشت'' تک ترقی کر جاتی ہے اور اگر اس میں اس سے بھی زیادہ درازی کی صلاحیت موجود ہے تو مولانا مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ یہی داڑھی دعوتوں میں پلاؤ کا ہاتھ پھیرنے، محافل میلاد میں شیرینی کو مکھیوں سے بچانے اور مساجد کی مرمت کے لئے چندہ وصول کرنے کے کام آتی ہے اور اس کے علاوہ مولانا کی مولانائیت کا تمام تر دار و مدار اسی پر ہے۔

کم از کم دارالعلوم ندوہ کے فارغ التحصیل ندوی حضرات میں یہ خوفناک قسم کی مولانائیت نہیں ہوتی اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ بھی داڑھی رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے سروں پر انگریزی بال بھی پائے جاتے ہیں وہ داڑھی رکھنے کے بعد موچھوں کو ''بدوی مولاناؤں'' کی طرح صاف نہیں کرا دیتے اور نہ وہ اپنی داڑھیوں کو اتنا آزاد کر دیتے ہیں کہ جہاں تک جی چاہے چلی جائیں حد ہی نہیں ہے، انگریزی بال اور ''معتدل ریش'' کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی باقاعدگیاں ہوتی ہیں مثلاً وہ شیروانی پہننا جانتے ہیں قمیض پہننے کو بھی گناہ نہیں سمجھتے ترکی ٹوپی پہن لیتے ہیں، پیروں میں فل بوٹ نہیں تو کم از کم ہاف بوٹ تو ضرور پہن لیتے ہیں اور اگر

بہت زیادہ مولانائیت غالب ہے تو پمپ پر اکتفا کرتے ہیں یہ نہیں کہ ایک ہاتھ کا پنجابی جوتا خریدا اور اس میں گھوڑے کے قسم کی نعلین جڑوائیں اور تیل میں بھگو کر پہن لیا وہ لوگ جرابیں پہننا بھی جانتے ہیں اور شیروانی کی جیب میں فاؤنٹین پن بھی رکھتے ہیں یہ تمام علامات اس بات کی ہیں کہ ندوہ میں روشن خیالی کا عنصر موجود ہے۔

علامہ شبلی نے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہوں گی ورنہ ظاہر ہے کہ نہ ''شمس العلماء'' ہوتے نہ ''علامہ'' کہلاتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''خضر راہ'' کا شبلی نمبر نہ نکلتا لیکن ہم تو ان کو اس حیثیت سے ''بڑا اچھا آدمی'' سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو ''مولانا'' بننے سے بچا کر ''انسان'' بنا دیا ورنہ یہ جو آج کل ندوی علماء دکھائی دیتے ہیں سب ایک سرے سے نہایت سخت قسم کے سرگھٹے ہوئے مولانا ہوتے اور ان سے بھی غیر مولانا مسلمان کا اسی طرح ناک میں دم ہوتا ہے جس طرح ''بدوی'' مولاناؤں سے ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ ندوی مولانا ہم کو مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے اور دہریت سے نہیں بچاتے لیکن آپ ہی بتایئے کہ ایک شخص کے لئے جو سرے سے پیر تک ہیٹ' سوٹ اور بوٹ میں ملفوف ہو یہ زیادہ آسان ہے کہ وہ سوٹ اتار کر شیروانی اور ہیٹ اتار کر ترکی ٹوپی پہن لے یا یہ آسان ہے کہ سوٹ اتار کر سر منڈوائے۔ چوگوشیہ ٹوپی منڈھے اور داڑھی بڑھا کر مونچھیں منڈوا دے' ہمارے خیال میں تو اس تبدیلی سے ندوی فیشن کو لوگ بہر صورت غنیمت سمجھیں گے اس لئے کہ اس تبدیلی کے بعد انسان کی صورت تو باقی رہتی ہے یہ کیا کہ ایک دم سے ایسی شکل وصورت بدل دی کہ دنیا والے ایک غیر جنس سمجھنے لگیں۔

سرسید علیہ الرحمۃ نے علی گڑھ کالج میں جہاں موجودہ تعلیم کو ضروری سمجھا وہاں دینیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جہاں کالج بنوایا وہاں مسجد بھی تعمیر کرائی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک علیگ اپنی مادری زبان بھی انگریزی بنا لینے کے بعد ''السلام علیکم'' کبھی نہیں بھولتا۔ تمام بات چیت انگریزی میں ہوگی لیکن السلام علیکم ضرور ساتھ ساتھ رہے گا اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو واللہ کوئی امتیاز بھی نہیں کر سکتا تھا کہ علی گڑھ کالج میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے ہیں یا کسی اور مذہب کے اس لئے کہ ایک شروع سے آخر تک یعنی سر سے پیر تک صاحب بہادر بنا ہوا انسان انگریزی میں گٹ پٹ' گٹ پٹ کرتا ہوا نظر آئے تو کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ حضرت ''ماتادین'' ہیں یا الفریڈ'' لیکن السلام علیکم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ باجود اس وضع قطع کے بزرگوار خدا کو ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا رسول سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں یعنی ''مسلمان'' ہیں۔ بالکل اسی طرح علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ندوۃ العلماء میں اپنی دینی تعلیم کو ضروری سمجھا وہاں جدید علوم کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ایک ندوی صرف مولانا نہیں ہوتا بلکہ اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں داخل ہو کر یہ ثابت کر دے کہ جہاں میں مسلمان ہوں وہاں انسان بھی ہوں یہ نہیں کہ بدوی مولاناؤں کی طرح مولانا تو ہو گئے لیکن انسانیت

سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگر علامہ شبلی کی مفید زندگی کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے اور صرف ندوۃ العلماء کو پیش نظر رکھ کر کوئی صاحب ہماری طرح شبلی نمبر خضر راہ کے لئے کوئی مضمون لکھنا چاہیں تو ان کو صرف اسی حیثیت سے علامہ ایک بڑے اچھے آدمی معلوم ہوں گے ہم تو ان کو "بڑا اچھا آدمی" سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ ہم کو کچھ معلوم ہی نہیں' لیکن اگر کسی کو کافی معلومات حاصل ہوں تو وہ اسی مبحث پر "خضر راہ" کے شبلی نمبر میں کافی لکھ سکتا ہے ہم نے تو جناب حامد ندوی اور حضرت کمال حامدی کے ڈر سے زبردستی یہ سطریں رمضان شریف میں لکھ ڈالیں اور تقاضوں سے جان چھڑائی۔ وہ تو کہیے کہ ہم بدوی یا ندوی کسی قسم کے مولانا نہیں ہیں ورنہ فتوے دے دیتے کہ رمضان شریف میں کسی قسم کا کوئی مضمون لکھنا قطعی حرام ہے۔ روزہ مکروہ ہو جاتا ہے بلکہ ٹوٹ جاتا ہے اور افطار کے بعد لکھنے سے ساٹھ روزے فرض ہو جاتے ہیں یا ایک سو چالیس مسکینوں کا کھانا۔

◆◆◆

منشی

تپ دق کے متعلق ماہرین طب کی جدید معلومات یہ ہے کہ وہ ہر مرض جو کسی طبیب کی سمجھ میں نہ آئے نہایت آسانی سے دق کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دق کی سینکڑوں قسمیں موجود ہیں پھیپھڑے کی دق، حلق کی دق، منہ کی دق اور ناک کان وغیرہ کی دق، مختصر یہ کہ آپ کو اختیار ہے کہ جتنی چاہیں دق کی قسمیں گڑتے اور تصنیف کرتے چلے جائیں، کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے، یہی حال اس مرض کا ہے جس کو عرف عام میں منشی کہتے ہیں، بلکہ اس مرض کی قسمیں تو دق سے بھی کہیں زیادہ ہیں، عدالتوں میں دیکھئے تو یہی مرض پھیلا ہوا ہو گا وکیلوں کو آپ اسی مرض میں مبتلا پائیں گے، کوتوالیوں، تھانوں اور پولیس کی چوکیوں میں آپ کو یہی وبائی بیماری نظر آئے گی، یہاں تک کہ آپ مویشی خانہ کو بھی منشی جی سے پاک نہ پائیں گے اور وہ ہندوستان جس کی متفقہ زبان اردو ہے آپ کو صرف منشیوں سے بھرا ہوا ملے گا۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاک خانوں کے سامنے بھی آپ کو کان میں قلم لگائے سڑک پر ٹاٹ بچھائے، منی آرڈر فارم گھٹنے پر رکھے اور ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے جو صاف نظر آئیں گے ان کے متعلق بھی اگر آپ تحقیقات کریں تو آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرت بھی منشی ہیں۔

منشیوں کی ان بے شمار قسموں میں سے ہم اس جدید قسم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی ولادت حال ہی میں صنعت فلم سازی کے ہمراہ ہوئی ہے چنانچہ آج آپ ہندوستان کی کسی فلم ساز کمپنی کو منشی کے مرض سے پاک نہیں پائیں گے اور یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ جب تک ہندوستان کی صنعت فلم سازی اس مہلک مرض سے پاک نہ ہو گی اس کے سرسبز ہونے اور پھلنے پھولنے کا کوئی امکان نہیں ہے یہ مرض اس صنعت کو مدقوق بنائے رکھے گا اور قبر سے ادھر پیچھا نہ چھوڑے گا ہم اس رائے پر کیوں پہنچے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

ہمارے ہی محلہ میں ایک صاحب رہتے تھے جن کا اسم مبارک لکھنے کی ضرورت نہیں، صرف خاں صاحب لکھ دینا کافی ہو گا۔ ان خاں صاحب کو تقریباً روز اس خاکسار کے پاس تشریف لانے کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی، اور وہ بھی صرف اس لئے کہ یہ خاکسار ان حضرت کی ملازمت کا کہیں کوئی انتظام کر دے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں جبکہ گریجویٹ جوتوں پر پالش لگاتے ہیں اور ڈبل گریجویٹ تانگہ ہانکتے ہیں کسی ایسے شخص کو ملازمت دلانا جس کا مبلغ علم اردو کی پہلی دوسری تیسری اور چوتھی ریڈر تک ہو کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن اس بے چارے کے واسطے واقعی متفکر رہتے تھے کہ کس طرح انکے لئے کوئی ایسا ذریعہ تلاش کر دیں کہ یہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ تھوڑے دنوں کے لئے ہم نے ان حضرت کو ایک بزاز کی دکان پر نوکر رکھوا دیا۔ اس کے بعد بزاز نے خاں

صاحب کو نالائق ٹھہرا کر اپنے یہاں سے نکالا تو ان کو ہم نے مشورہ دیا کہ کچہری کے پاس بیٹھ کر عرائض نویسی شروع کر دیں لیکن اس مشغلہ سے خود خاں صاحب اس لئے جلدی گھبرا گئے کہ ان کے متعلق یہ شکایت دو ہی تین دن میں پیدا ہو گئی کہ خط بھی خراب ہے اور املا بھی درست نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ جس نے بھی آپ سے عرضی لکھوائی اسی نے اپنی لٹیا ڈبوائی مجبوراً خاں صاحب کو پھر ہم سے کسی جدید مشورے کے لئے تبادلہ خیال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں ایک مقامی سینما ہاؤس کے منیجر صاحب کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے ہم نے ان سے کہہ سن کر ان حضرت کو سینما ہاؤس میں چار آنے والے درجہ کی گیٹ کیپری پر بہ مشاہرہ پندرہ روپے ماہوار سکہ رائج الوقت کہ نصف جس کے سات روپے آٹھ آنے ہوتے ہیں نوکر رکھوا دیا۔ یہ ملازمت خاں صاحب کو بے حد پسند تھی اس لئے کہ اول تو اس ملازمت میں ان کو اپنے علمی کمالات کے مظاہرہ کا کوئی موقع نہ ملتا تھا، دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ چار آنے والے معزز ناظرین سینما پر حکومت کرتے تھے کسی نائی کو بغیر ٹکٹ کے جانے کی اجازت دے دی اور دوسرے دن اس کی دکان پر جا کر مفت میں بال کٹوا لئے۔ کسی کے یہاں سے اسی معاصرانہ تبادلہ کے ماتحت ترکاری کا لین دین تھا۔ کوئی ان حضرت کی خوشامد میں پان کھلاتا تھا تو کوئی محض اس لئے سگریٹ پیش کرتا تھا کہ اس کو اچھی جگہ مل جائے پھر ہمارے خاں صاحب کو یہ بات تو بے حد پسند تھی کہ جب تک تماشہ شروع نہیں ہوا اس وقت تک ٹکٹ وصول کرتے رہے اور اس کے بعد کالے پردے پر منہ ڈال کر روز تماشہ مفت میں دیکھتے تھے قصہ مختصر یہ کہ وہ اپنی اس ملازمت سے نہایت خوش تھے اور ان کی خوشی اور اطمینان کا اندازہ ہم کو اس بات سے ہوتا تھا کہ اب وہ بھول کر بھی ہمارے غریب خانہ کا رخ نہیں کرتے تھے۔

خاں صاحب کی اس ملازمت کو بمشکل چھ یا سات ماہ گزرے ہوں گے کہ ایک دن خاں صاحب نے ناگہانی طور پر غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا اور ہم کو باہر ہی بیٹھا ہوا دیکھ کر قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے ہم خاں صاحب کی اس تشریف آوری سے ذرا متفکر ضرور ہوئے کہ کہیں ان حضرت نے اس ملازمت کو بھی چھوڑ تو نہیں دیا، لیکن ان کے تیوروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ملازمت کی طرف سے مطمئن ہیں بہر حال ہم نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا۔

’’کہئے خاں صاحب خیریت تو ہے، سینما میں بدستور ملازمت ہے نا‘‘

خاں صاحب نے فرمایا: ’’جی ہاں سینما میں بدستور ملازم ہوں اور بفضلہ سب خیریت ہے۔‘‘

ہم نے کہا ’’خدا کا شکر ادا کیجئے اور اس ملازمت کی قدر کیجئے کہیں اس کو بھی نہ چھوڑ بیٹھئے گا۔

خاں صاحب نے لاپروائی کے ساتھ کہا: جی ہاں خدا کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے مگر اب میرا ارادہ ذرا بمبئی جانے کا ہے، بات یہ ہے کہ مجھ کو اس وقت روپیہ کی سخت ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہاں جا کر اپنا ایک آدھ ڈرامہ کسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کر

ڈالوں۔

ہم نے حیرت سے کہا: ’’کیا فرمایا آپ نے ڈرامہ؟‘‘

خاں صاحب نے نہایت معمولی بات سمجھ کر کہا ’’جی ہاں میں نے دو تین فلمی ڈرامے لکھے ہیں لکھے تو ہیں خیر چھ سات مگر ان میں سے تین ایسے ہیں کہ ہر فلم کمپنی منہ مانگے دام دے کر خرید لے گی۔‘‘

ہم نے خاں صاحب کو چشمہ لگا کر سر سے پیر تک دیکھا' اور پھر کہا ’’آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔‘‘

خاں صاحب نے غالباً ہمارے اس سوال کو سمجھے بغیر فرمایا۔ ’’الحمدللہ' کوئی خاص شکایت تو نہیں' وہی معدہ کی خرابی چلی جاتی ہے اب بمبئی جا رہا ہوں انشاءاللہ وہاں اس کا علاج بھی جم کر کرا لوں گا۔‘‘

ہم نے کہا ’’مگر بمبئی جانے کے لئے آپ سے کس نے کہا ہے؟‘‘

خان صاحب نے کہا: بات یہ ہے کہ میں نے لکھے ہیں ڈرامے اور وہ ڈرامے میں نے دو تین کمپنی والوں کو سنائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت آسانی کے ساتھ فروخت ہو سکتے ہیں اور میرا بھی خیال یہ ہے کہ ان ڈراموں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا میں ایک ڈرامہ لایا ہوں اس کا تھوڑا سا حصہ آپ سنئے اور دیکھئے کہ آج کل جو ڈرامے عام طور پر آ رہے ہیں ان میں اور میرے اس ڈرامے میں کیا فرق ہے؟‘‘

ہم نے حیرت سے کہا: ’’مگر آپ ڈرامہ لکھنا کیا جانتے تھے اور پھر فلمی ڈرامہ‘‘

خاں صاحب نے انکساری کے ساتھ تبسم فرماتے ہوئے: ’’تو خدا کی دین ہے ملاحظہ فرمایئے اس کا نام ہے ’’جلاد کی بیوی‘‘ اور پہلا منظر یہ ہے کہ سہیلیاں حمد گا رہی ہیں۔

تو بڑا رحیم ہے
تو بڑا کریم ہے
تو ہے سب سے اعلیٰ بالا
سب سے تو عظیم ہے
ارے ہاں
تو بڑا رحیم ہے

ارے ہاں
تو بڑا کریم ہے

سہیلیاں دو قطاروں میں ناچتی ہوئی دائیں اور بائیں ہاتھ کی طرف چلی جاتی ہیں اور فوراً ایک کمرہ کی تصویر سامنے آ جاتی ہے جس میں ایک خوبصورت شخص سوٹ پہنے ہوئے بیٹھا ہوا گانا گا رہا ہے۔

تم نے تو مجھے بالکل دیوانہ بنایا ہے
اور قلب کو میرے بھی پیمانہ بنایا ہے

اس شعر کو وہ دو مرتبہ پڑھتا ہے پھر گٹکری لے کر دوسرا شعر پڑھتا ہے۔

ایسے ہی تیرے عاشق جاں باز بنے ہوں گے
ہم نے اپنے گھر کو در جاناں بنایا ہے

ہم نے اب تک ضبط کیا مگر اب مجبوراً کہہ اٹھے: ”خاں صاحب یہ شعر تو موزونیت سے بھی بالاتر ہے۔

خاں صاحب نے کہا: ”آپ نہیں جانتے میں نے گا کر دیکھ لیا ہے طبلہ اور ساز پر ٹھیک اترے گا“ آگے سنئے۔

اس شعر کو بھی دو تین مرتبہ گانے کے بعد وہ تیسرا شعر گاتا ہے۔

اغیار کا تو حامی اللہ ہمارا ہے
اس نے تو ہم کو تیرا دیوانہ بنایا ہے

اس شعر کے پڑھتے ہی ایک نہایت خوبصورت لڑکی ساڑھی باندھے بال کھولے ہوئے دوڑتی ہوئی آتی ہے اور اس شخص کے پاس آ کر ذرا شرم سے کہتی ہے۔ ”پیارے موہن تم نے تو ایسا گایا کہ میں بیتاب ہو گئی‘ زندگی میری عذاب ہو گئی میں خانہ خراب ہو گئی۔“

موہن ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے۔ ”پیاری شیلا تم نہیں جانتی“

جنہیں ہے عشق صادق وہ کہیں فریاد کرتے ہیں
لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں
اسے گانا نہیں آہ دل عاشق سمجھ اس کو
اسی سے دل کے ویرانے کو ہم آباد کرتے ہیں

شیلا آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی ہے۔ ”آہ پیارے موہن ہماری اور تمہاری زندگی اب کیوں کر بسر ہوگی اور اس شام جدائی کی کیسے سحر ہوگی“

موہن:

اگر ہے عشق رسوائی بھی اپنی در بدر ہو گی
شب و روز ہو گی یعنی دیکھنا شام و سحر ہو گی
اسی دن عشق کو تم میرے سچا جانو گی شیلا
مرے مرنے کی جس دن آپ کو گھر میں خبر ہو گی

خاں صاحب جھوم جھوم کر اپنا ڈرامہ سنا رہے تھے اور ہمارا یہ حال تھا کہ دماغ چکرانے لگا تھا۔ بار بار ہم نے ارادہ کیا کہ خاں صاحب سے کہہ دیں کہ بس کیجئے' اندازہ ہوگیا کہ یہ ڈرامہ کیسا ہوگا' مگر خاں صاحب سانس ہی نہ لیتے تھے چنانچہ جیسے ہی ہم نے ارادہ کیا کہ ان کو روکیں انہوں نے جھوم کر ڈرامہ پڑھنا شروع کیا۔

شیلا سسکیاں لے لے کر رونا شروع کرتی ہے اور رو رو کر گاتی ہے۔

خدا کرے محبت میں موت آ جائے
خدا کرے کہ غم دل مجھی کو کھا جائے

ہم نے کہا: ”خاں صاحب یہ کیا خلاف وضع موزوں شعر کیسے کہہ دیا؟“

خاں صاحب نے کہا ”اس موقع پر ایسے ہی شعر کی ضرورت تھی شیلا سسکیاں لے لے کر اس شعر کو پڑھتی ہے اور موہن بھی روتا ہے دوسرا شعر موہن پڑھتا ہے۔

تجھے نہیں مجھے الفت میں موت آ جائے
تجھے نہیں غم دل مجھ کو آ کے کھا جائے

دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں اور فوراً ہی دوسرا منظر شروع ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ خاں صاحب دوسرا منظر شروع کریں ہم نے کہا۔ ”خاں صاحب بس کیجئے میں نے اندازہ کر لیا کہ یہ ڈرامہ کیسا ہو گا؟“

خاں صاحب نے خود ہی کہا کیسا ہوگا جب فلم میں آ جائے تب دیکھئے گا کہ یہ ڈرامہ کیا چیز ہوتا ہے۔“

ہم نے کہا: ”مگر خاں صاحب! اس کے متعلق آپ یہیں سے خط و کتابت کرتے تو اچھا تھا‘ اس ڈرامہ کو آپ بذریعہ ڈاک بھیج دیں اگر پسند آ گیا تو پھر آپ چلے جایئے گا اور دام طے کر لیجئے گا۔“

خاں صاحب نے ہم کو بیوقوف سمجھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”واہ‘ واہ واہ‘ ڈرامہ اگر میں بھیج دوں تو وہ اس کو فوراً نقل کر کے چرا لیں گے اور مجھ کو ایک ڈبل بھی نہ ملے گا۔“

ہم نے کہا: ”خاں صاحب بات یہ ہے کہ اس طرح آپ لگے ہوئے روزگار کو چھوڑ کر جائیں گے میں تو اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں۔

”نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے“

والا قصہ خدانخواستہ نہ پیش آئے۔

خاں صاحب نے کہا ”نہیں آپ اطمینان رکھیں اب آپ مجھ کو نہایت اچھی حالت میں پائیں گے۔“

خاں صاحب اس قسم کی گفتگو کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہوئے اور ہم نے ان کی طرف سے مایوس ہو کر ان کو انہی کی حالت پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ کچھ ہی دن کے بعد ہم نے یہ خبر بھی سن لی کہ خاں صاحب بمبئی سدھار گئے۔

اس واقعہ کو بمشکل سات آٹھ مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک روز ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے بید ہلاتے اور منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے خاں صاحب غریب خانہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں ہم کو دیکھتے ہی خان صاحب نے ایک مرعوب کرنے والے انداز سے کہا۔ ”السلام علیکم“ ہم نے مصافحہ کرتے ہوئے خاں صاحب کو اپنے قریب بٹھالیا اور مزاج پرسی وغیرہ کے بعد ان سے پوچھا۔ ”کب تشریف لائے؟“

خاں صاحب نے کہا۔ ”کل ہی آیا ہوں‘ یہاں لکھنؤ میں کچھ مناظر میرے فلم کے لئے جائیں گے ان کے لئے آیا ہوں۔“

ہم نے کہا۔ ”اور مشغلہ کیا ہے کچھ تفصیل سے بتاؤ تو سہی؟“

خانصاحب نے کہا: ”اللہ کا شکر ہے کہ ایک فلم کمپنی میں منشی ہوں پانچ سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے اور مکان کمپنی کی طرف سے ہے اس کے علاوہ دوسری کمپنیوں کو بھی معاوضہ پر ڈرامے وغیرہ دیتا ہوں‘ آٹھ نو سو روپیہ ماہوار آمدنی کی اوسط ہے۔

ہم نے خاں صاحب کو حیرت سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ یہ شخص جھوٹ نہیں کہہ رہا ہے اس لئے ظاہری شان بھی ان کے بیان کی

شہادت دے رہی تھی کم از کم یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ خاں صاحب خوش ہیں اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں ظاہر ہے کہ ان کی ذاتی قابلیت کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ ثبوت تھا ہندوستانی صنعت فلم سازی کی پستی اور بدتمیزی کا ذرا غور تو کیجئے کہ جب ہمارے محترم جناب خاں صاحب کے ایسے ڈرامہ نویس ہو سکتے ہیں تو اس ڈرامہ کا اور اس ڈرامہ کے فلم کا کیا کہنا جو آپ کا نتیجہ فکر ہو۔ ہم ایک عالم استعجاب میں منہ کھولے ہوئے اور آنکھیں پھاڑے ہوئے غور کر ہی رہے تھے کہ خاں صاحب نے خود ہی اس سکوت کو توڑتے ہوئے فرمایا۔

''یہ سب کچھ آپ ہی کا عطا کیا ہوا ہے آپ نے میرے ساتھ جو احسانات کئے ہیں ان کا بدل مجھ سے ممکن نہیں نہ آپ مجھ کو سینما میں گیٹ کیپر کی حیثیت سے نوکر رکھواتے نہ میں آج اس قابل ہوتا کہ اتنی بڑی تنخواہ حاصل کروں جو میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔

ہم نے کہا: ''خاں صاحب میں تو حیران ہوں کہ کن الفاظ میں آپ کو مبارکباد دوں مگر یہ تو فرمایئے کہ تنخواہ جو آپ کی پانچ سو روپیہ ہے وہ بصورت نقد ہے یا بد قرض یعنی وہ آپ کو ماہ بماہ ملتی رہتی ہے یا کمپنی کے ذمہ واجب الادا ہوتی رہتی ہے۔''

خاں صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''میں ایک ایک پائی گنوا لیتا ہوں بات یہ ہے کہ کمپنی والے تو مجھ کو اس خیال سے سونے کی چڑیا سمجھتے ہیں کہ میں لکھنو کا ہوں پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں ان کو مکمل ڈرامہ دیتا ہوں یہ نہیں کہ صرف مکالمہ دے دیا میں سٹوری سیزیو' گانے' مکالمے اور سب کچھ دیتا ہوں یعنی دو تین آدمیوں کا کام خود ہی کرتا ہوں' دوسری کمپنیوں میں ان میں سے ہر کام کے لئے علیحدہ علیحدہ آدمی نوکر ہیں۔

ہم نے کہا: ''مگر واللہ خاں صاحب تم ہو قسمت کے لارڈ کلائیو ضرور' ماشاء اللہ تم نے خوف ترقی کی اچھا یہ تو بتاؤ کہ کب تک قیام رہے گا؟''

خاں صاحب نے کہا کہ لکھنو میں چھ سات روز کا کام ہے۔ اس کے بعد ہماری پارٹی گوالیار چلی جائے گی اس لئے کہ گوالیار کے قلعہ کا بھی سین لینا ہے۔ میں نے ڈرامے میں دکھایا ہے کہ گویا آصف الدولہ نے گوالیار کے قلعہ پر حملہ کیا لہٰذا امام باڑہ آصف الدولہ کی تصویر لینا بھی ضروری تھا اور گوالیار کے قلعہ کے مناظر بھی لئے جائیں گے یہ ایک تاریخی فلم ہے اور اس کی بڑی دھوم ہے' ابھی سے اس میں دکھایا گیا ہے کہ مہاراجہ گوالیار لکھنو کی چھتر منزل تک گوالیار سے سرنگ لگا کر آ پہنچا' اس کے بعد نواب آصف الدولہ نے گوالیار پر جوابی حملہ کیا اور قلعہ کو فتح کر لیا اس جنگ میں آصف الدولہ کی طرف سے شیر شاہ لڑ رہا ہے اور مہاراجہ گوالیار کی طرف س

ٹوڈرمل سب تاریخ ہند حصہ اول اس فلم میں بھری پڑی ہے۔“

ہم نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: ”آپ نے ڈرامہ لکھنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ہند خوب اچھی طرح پڑھی ہے۔“

خاں صاحب نے کہا: ”جی اور کیا کوئی آسان کام ہے ڈرامہ لکھنا بعض اوقات تو جغرافیہ تک کا بھی کام پڑتا ہے۔“

خدا کی شان دیکھئے کہ اس کندہ ناتراش کو بمبئی کی فلم کمپنی پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ دے رہی تھی اور یہ بے مرمت چغد ڈرامہ نویسی کی غلط فہمی میں مبتلا تھا ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت ہم اس فریب خوردہ قابلیت سے ہمدردی کریں یا فلم کمپنی سے جس میں یہ منشی تھے یا اس ہندوستان سے جس نے خاں صاحب کا ایسا مایہ ناز شیکسپئر ہند اور ان شیکسپئر ہند کی قدردان فلم کمپنی کو اس ملک میں پیدا کیا تھا جس ہندوستانی فلمسازی کی ترکیب خاں صاحب جیسے عناصر سے ہو اس صنعت سے ترقی کی امید رکھنا سوائے حماقت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس وقت تو خاں صاحب ہم پر رعب جما ہی رہے تھے اور ہم ان سے مرعوب ہونے کے لئے مجبور تھے اس لئے کہ ہم ٹھہرے ایک غیر متعلق آدمی اور وہ ٹھہرے ایک مستند ڈرامہ نگار اور ذمہ دار منشی، ہم نے بات ٹالنے کے لئے ان سے کہا۔

”بڑا لطف رہتا ہوگا سٹوڈیو میں“

خاں صاحب نے ذرا اکڑ کر کہا: ”کچھ نہ پوچھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت الفردوس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف حوریں ہی حوریں نظر آتی ہیں اور سب تابع فرمان، اجی وہ تو وہ خود مالک کمپنی صاحب اور ڈائریکٹر صاحب بھی آپ کی دعا سے آپ کے غلام ہی بنے رہتے ہیں ہر وقت کیا مجال کہ اس خاکسار کے کسی حکم کو ٹال تو دیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی دعا سے اتنا اثر ہے کہ گویا سب زر خرید ہیں اور اس کمپنی میں کیا، بمبئی آ کر دیکھئے تو پتہ چلے کہ طوطی بول رہا ہے آپ کے نیاز مند کا۔“

ہم نے کہا: ”کیوں نہیں صاحب“

”کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی“

خاں صاحب نے کہا: ”اچھا یہ بتائے کہ اب بمبئی کب تشریف لائیے گا۔ ضرور تشریف لائیے بلکہ میرے ساتھ ہی چلئے۔“

ہم نے تکلف سے نہیں بلکہ واقعی کہا: ”اجی ہم کہاں جا سکتے ہیں مصروفیات سر اٹھانے نہیں دیتی، بہرحال اگر اتفاق سے کبھی آ گئے تو ظاہر ہے کہ آپ ہی پر دھرنا دیں گے۔“

خان صاحب ادھر ادھر کی گفتگو کر کے تشریف لے گئے اور ہم بھی اپنے کام میں مصروف ہو کر اس ملاقات کے خیال کو محو کرنے پر مجبور ہوئے۔ پھر نہ خاں صاحب سے ملاقات ہوئی نہ ان کا خیال آیا لیکن اتفاق سے دو ہی مہینے کے اندر ایک عزیز کی شادی کے

سلسلہ میں ہم کو ناگہانی طور پر کچھ اس طرح بمبئی جانا پڑا کہ ہم خاں صاحب کو اطلاع بھی نہ دے سکے اور ایک دم بمبئی پہنچ گئے، بمبئی میں شادی کی مصروفیات نے دو روز تک مہلت ہی نہ دی لیکن تیسرے دن ہم خاں صاحب کی فلم کمپنی ڈھونڈھتے ہوئے دادر پہنچ گئے اور وہاں ان کی کمپنی کا سراغ لگا ہی لیا لیکن کمپنی پہنچ کر ہم کو جن صاحب کے پاس پہنچایا گیا وہ کچھ عجیب جوش سے تھے اول تو ہم کو کرسی ہی نہ دی دوسرے خان صاحب کی شان میں گستاخیاں شروع کر دیں۔ ہم نے جیسے ہی پوچھا کہ منشی صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں اس ہشو نے کہا۔

''ہم نہیں جانتا بابا کون مونسی ہے روئی والا کی دوکان پر تم پوچھو''

ہم نے حیرت سے کہا: ''جناب میں آپ کے ڈرامہ نویس منشی یعنی خاں صاحب کو پوچھ رہا ہوں جو لکھنو کے ہیں وہ بھلا روئی والے کی دکان پر جائیں گے۔''

اس بداخلاق جانور نے ہم کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچا تو ہمارے پتلون کا جیب میں بیٹا ہے نکال لو تم سے بولا کہ روئی والے کی دکان پر دیکھو۔''

ہم مایوس ہو کر وہاں سے نکلے ہی تھے کہ خاں صاحب ایک تہبند باندھے واسکٹ اور اس کے نیچے بنیان پہنے کندھے پر تولیہ ڈالے آتے ہوئے نظر آئے۔ ہم ان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک اور پارسی قسم کی انسان نما مخلوق نے ان کو بڑی زور سے ڈانٹا۔

''او مونشی، تم کہاں گیا تھا، ادھر آؤ، ایک پاکٹ قینچی سگریٹ گھوڑا مارکہ دیا سلائی لاؤ۔''

ہمارے خاں صاحب تعمیل حکم میں پیسے لے کر فوراً لپکے، ادھر ہم نے ایک ملازم سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے جنہوں نے سگریٹ منگائی ہے اس نے بتایا کہ ایک چیف ایکٹر ہیں ہم نے اس آدمی کو آڑ میں لے کر خان صاحب کے متعلق متعدد سوالات کئے اور جو جوابات اس نے دیئے اس کے بعد ہم نے یہ فخر اپنے لئے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ خاں صاحب سے یہاں ملیں معلوم یہ ہوا کہ وہ منشی تھے تو ضرور مگر بجائے پانچ سو کے پچیس روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔

البتہ کبھی کبھی آمدنی اس طرح ضرور ہو جاتی تھی کہ کوئی مریھکا ڈرامہ نویس کوئی ڈرامہ لکھ کر لایا آپ نے اس ڈرامہ کو مسترد کرا دیا اور جب وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو سو پچاس روپیہ دے کر ڈرامہ لے لیا اور اس کو ادھر ادھر سے کانٹ چھانٹ کر لی اگر وہ تک کا ہوا تو بے تکا بنا کر کمپنی کے ہاتھ دو ڈھائی سو روپیہ کا بیچ دیا۔

چنانچہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس زمانہ میں آپ لکھنو تشریف لے گئے تھے اس زمانہ میں اتفاق سے دو اسی قسم کے ڈرامے بک گئے

تھے۔ لہٰذا قانوناً اخلاقاً ہر حیثیت سے آپ کو اس کا حق پہنچتا تھا کہ اپنے کو پانچ سو روپیہ ماہوار کا ملازم ظاہر کریں، ہم ان کے اوپر لاحول پڑھتے ہوئے الٹے پیروں واپس ہوئے اور اب تک جب سال دو سال کے بعد ان سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ ڈینگ ہانکتے ہیں تو ہم لاحول ولاقوۃ کا وظیفہ شروع کر دیتے ہیں اور دل یہی چاہتا ہے کہ قینچی سگریٹ اور گھوڑا مارکہ دیا سلائی منگانے کا ان کو حکم دے دیں۔

◆◆◆